مطالعۂ فن ترجمہ
اور
منتخب مضامین
مصنف
بشیر احمد
دنیا پبلیکیشنز

مطالعۂ فن ترجمہ اور
منتخب مضامین

مصنف
بشیر احمد

یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

زیر اہتمام
دنیا پبلیکیشنز

Mutalai- Fan-e-Tarjuma aur Muntakhab Majameen -By Bashir Ahmad

نام۔ مطالعہ فنِ ترجمہ اور منتخب مضامین
نوعیت۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین
مصنف۔ بشیر احمد
صفحات۔ 160
قیمت۔ 120
سائز۔ 23X36/16
سن اشاعت۔ اکتوبر 2005
ناشر۔ مصنف
ملنے کا پتہ۔ اے/78.جی 3، دلشاد کالونی دہلی 95
ڈی/2/5/13/ڈی ایل، ایف، دلشاد ایکس ٹینشن 2 بھوپڑا، غازی آباد (یو۔ پی)۔ پوسٹ بوکس نمبر۔9519 Delhi-95
یہ کتاب دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

فہرست مضامین

۸۷۶

پیش لفظ

اس مجموعۂ مضامین میں ۱۲ مضامیں شامل اشاعت ہیں۔ترجموں سے متعلق ۵ مضامین ہیں۔مگر ''موازنہ سرور سلطانی اور شاہنامہ اردو'' اور ''باغ و بہار کی نثر اور منشی نظام الدین'' بھی ترجمے کے مسائل و معاملات کو سمجھنے میں معاون ہونگے۔اس طرح ترجمے سے متعلق سات مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں۔

موازنہ سرور سلطانی اور شاہنامہ اردو۔اقبال اور انکی اولین تصنیف۔اپ بھرنس اور اردو۔باغ و بہار کی نثر اور، یہ چاروں مضامین تحقیقی ہیں۔ان موضوعات پر ابھی اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔باغ و بہار کی نثر کے لئے اور اس داستان کی سادگی کے لئے بھی میر امن کو داد دی جاتی ہے جب کی یہ کارنامہ منشی نظام الدین کا ہے۔یا کم سے اس کا بھی اہم ہاتھ ہے۔

تحقیق کی کمی کی وجہ سے اردو میں کئی جھوٹ، سچ کا درجہ اختیار گئے ہیں ان سے نسل در نسل غلط فہمیوں کا سلسلہ چل رہا ہے۔ہمارے یہاں کتابیں یا مضامین لکھتے وقت تازہ تریں تحقیقات پر توجہ نہیں دی جاتی اور کہنہ،فرسودہ مواد کی بنیاد پر بغیر سوچے سمجھے کتابیں اور مضامین لکھے جاتے ہیں، نتیجہ یہ کہ کئی غلطیاں جن کی اصلاح ہونی چاہئے ابھی تک مروج ہیں۔انھیں غلطیوں میں ایک بھیانک غلطی یہ ہے کہ ہم بغیر سمجھے بوجھے یہی لکھتے اور طلباء کو پڑھاتے ہیں کہ اردو اور دوسری جدید ہندوستانی زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں۔ہم اس بات پر بالکل غور نہیں کرتے کہ خود سنسکرت کا لفظ اس بات کا غماز ہے کہ اس زبان کو چھان پھٹک کے، صاف ستھرا کر کے مہذب بنایا گیا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ سنسکرت سے پہلے کچھ زبانیں تھیں جن کو صاف ستھرا کر کے

سنسکرت بنائی گئی۔ کوئی یہ بھی نہیں سوچتا کہ سنسکرت کی آمد سے پہلے ہندوستان اور ایران کے باشندے، گونگے نہیں تھے۔ اور نہ ہی دکنی ہندوستان کے لوگوں کی طرح وہ تمل، تلگو ،اور ملیالم زبانیں بولتے تھے۔ اتری ہندوستان۔ گنگا جمنا کے میدانی علاقوں میں بھی آبادی تھی مگر ظاہر ہے کہ ان علاقے کے لوگوں کی زبانیں ملیالی تمل یا تلگو نہیں تھیں۔ یہاں وہی زبانیں بولی جاتی تھیں جن سے جدید ہندوستانی زبانیں نکلی ہیں۔ جدید زبانیں بشمول اردو اور ہندی اس زبان کی وارث ہیں جس سے سنسکرت بنائی گئی ہے۔ ایک اور ہمالیائی غلط فہمی یہ سمجھ ہے کہ عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے ملنے سے (اختلاط سے) اردو زبان بنی ہے۔ ہر زبان کی ایک اساس ہوتی ہے اسے ہم زبان کا ڈھانچہ یا سانچہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو آسانی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستان کی تمام جدید زبانوں بشمول ہندی اور اردو کا سانچہ ایک یا یکساں ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''مطالعۂ ہندوستانی'' میں ان پر روشنی ڈالی ہے۔

لفظ کاری پر ابھی تک کوئی باضابطہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ حالانکہ اس کی شدید ضرورت ہے۔ اصطلاح سازی کے مختلف اداروں میں جو اصطلاحین بنی ہیں ان کے تقابلی مطالعے کی بھی ضرورت ہے۔

اس مجموعے میں ایک مضمون اختر انصاری کی شخصیت اور فن پر ہے۔ اور دو مضامین عرف عام میں ''غیر ادبی'' ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ادب صرف تخلیقی ادب کا نام نہین بلکہ جو کچھ لکھا جاتا ہے یا باضابطہ بولا جاتا ہے وہ سب ادب کا حصہ ہے۔ ہمیں تخلیقی ادب اور ادب مین تمیز کرنی ہوگی۔ تحریر یا تقریر کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں تخلیقی ادب ہو یا علمی ادب یا محض کسی چیز کا اشتہار، یا معلوماتی اظہار یہ سب ادب کا حصہ ہیں۔

دراصل اس مضموعے میں مختلف اقسام کے مضامین کے نمونے پیش کئے گئے ہین۔ اس لئے کہ میں نے بہت سے موضوعات پر لکھا ہے مگر کتابی صورت میں شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ اگر صرف ان اداریوں کو ترتیب دے کر شائع کر دیا

جائے جو 1970 سے میں لکھتا رہا ہوں تو کئی مجموعے تیار ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کو، سیکولر ہندوستان، (مظفر پور۔ بہار) سیکولر ڈیموکریسی (دہلی) حیات (دہلی)۔ اردو دنیا (دہلی) اور فکر و تحقیق (دہلی) کے علاوہ الدنیا، چنگاری (دہلی) Human Era Delhi اور ہم سب لوگ، ہندی (دہلی) وغیرہ میں میرے اداریئے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے انھیں اندازہ ہے کہ کئی بار میں نے اپنے اداریوں میں ایسے سوالات اٹھائے، اور ایسی مطالبات کئے جو اس زمانے کے زیادہ تر قاری کے لئے بے معنی تھے اس لئے کہاں مطالبات کا پورا ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ جب میں نے کئی بار ان Issues کو اٹھایا تو جیسا میں چاہتا تھا ہوا۔ مثلاً میں نے چنگاری میں یہ مسلسل لکھا کہ سرکاری ملازموں کو کم سے کم ہفتے میں دو دنوں کی چھٹی ملنی چاہئے۔ ہمارے کئی دوست میرا مذاق اڑاتے تھے۔ مگر جب راجیو گاندھی وزیر اعظم بنے تو پانچ دنوں کا ہفتہ ہو گیا۔

اسی طرح میں Human Era میں مسلسل لکھ رہا تھا کہ گورنمنٹ ڈیپارٹمنٹ کے سکریٹریز کو بھی توہین عدالت کے لئے سزا ملنی چاہئے چاہے وہ قصوروار ہوں یا نہیں۔ لوگ کہتے تھے یہ عجیب بات ہے جس آدمی نے قصور نہیں کیا اسے سزا کیوں دی جائے۔ مگر Secretries کو سزا کا سلسلہ شروع ہوا۔

اب میں یہ مہم چلا رہا ہوں کہ اردو۔ دلت، مسلمانوں، بے قصور سزا یافتہ لوگوں، کے تحفظ میں عوامی تحریک چلائی جائے اور عدالتوں کے دروازے پر دستک دی جائے۔ امید ہے اس سمت میں بھی کچھ نہ کچھ ہوگا۔

میرے اردو اخبار یا انگریزی اخبار شائد ہی ارباب حل و عقد کی نظر سے گزرتے ہونگے۔ مگر اس کے باوجود اس میں لکھی جانے والی تحریروں کا اثر ہوتا ہے تو ضروروئی بات ہے۔ شائد اللہ کا یہ کرم ہے کہ وہ خلوص سے لکھی گئی تحریروں کو قبولیت عطا کرتا ہے۔

آخر میں اردو اکادمی دہلی کے ارباب حل و عقد کا شکر گزار ہوں کے انھوں نے زیر نظر مجموعے کی اشاعت کے لئے مالی تعاون فراہم کیا۔ بشیر احمد

ترجمہ کاری

ترجمہ کیا ہے؟ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ترجمہ اظہار خیال یا اظہار ذات یا کسی اور طرز کا اظہار ہے مگر راست اظہار نہیں، بلکہ اظہار کی ترجمانی پر مبنی اظہار ہے۔ گویا اس کی حیثیت ثانوی ہے۔

ثانوی چیزیں اولی سے زیادہ پیچیدہ اور بہتر بھی ہو سکتی ہیں اور بدتر بھی۔

البتہ نقش ثانی چاہے اول سے بہتر ہو مگر اس کا وجود نقش اول کا محتاج ہوتا ہے۔ اور نقش اول کے بغیر بے وجود ہوتا ہے۔ دوسری طرف نقش ثانی کے بغیر نقش اول ادھورا ہوتا ہے۔ نقش ثانی نقش اول کو مکمل کرتا ہے۔

ترجمہ لازمی اور ناگزیر مجبوری ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ترجمہ اپنا ایک وجود رکھتا ہے جو نقش اول پر مبنی اور منحصر ہونے کے باوجود منفرد ہوتا ہے۔

ترجمہ کیسے کرنا چاہیئے؟

جس طرح تمام افراد یکساں ہوتے ہوئے بھی تھوڑا بہت الگ ہوتے ہیں بالکل اسی طرح تمام تحریری اور تقریری اظہار یکساں ہوتے ہوئے بھی منفرد ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی میں انفرادیت زیادہ ہوتی ہے، کسی میں کم۔

زبان تحریری ہو یا تقریری اس کی کئی اصناف (قسمیں) ہوتی ہیں۔

بات چیت بھی زبان ہے، شعر بھی زبان کا حصہ ہے، کہانی، خبر، روداد، انشائیہ، مقالہ، داستان، حکایت، رمزیہ، اور مختلف علوم کا تحریری یا تقریری اظہار، یہ سب زبان کے دائرے میں آتے ہیں۔ مگر ہر اظہاریہ کے ترجمے کے تقاضے کم و بیش مختلف ہیں۔

بات چیت علمی بھی ہو سکتی ہے اور غیر علمی یا عام، محض بیان واقعہ یا اظہار ذات یا محض بکواس، ان سب کے ترجموں میں فرق ہوگا۔

خبروں یا واقعات کی رپوٹنگ کا ترجمہ سب سے آسان ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ دھیان رکھنا چاہیئے کہ خبر یا رپورٹنگ کا موضوع کیا ہے۔ اگر موضوع علمی ہے تو پھر عام خبر کی بہ نسبت اس کا ترجمہ مشکل کام ہے۔ مگر اس مشکل کام کو آسان بناتا ہے مترجم کا مطالعہ، تجربہ، اور مشق ۔ریاض۔

اسلوب میں بالعموم اسلوب نگار کی شخصیت جھلکتی ہے اور اگر اسلوب نگار صاحب طرز ہے تو پھر دشواریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ لیکن بالعموم صاحب طرز مترجم دشواریوں پر جلد قابو پالیتا ہے، اور نئی راہ نکال لیتا ہے۔

یہ بات پورے طور پر تو نہیں مگر بہت حد تک درست ہے کہ اچھا ترجمہ وہ ہے جو اصل زبان کے پورے مفہوم کو بلا کم و کاست دوسری زبان کے قالب میں ڈال دے۔ ترجمہ جس طرح مفہوم سے ہٹ کر اصل محاورے کا قائم مقام نہیں رہتا، اسی طرح محاورے سے ہٹ کر صحت سے محروم ہوجاتا ہے، اس لئے صحت کے ۔۔وہ کوئی پہلو اچھے ترجمے کا معیار قرار نہیں پا سکتا۔

مثلاً انگریزی لفظ ہے FAST اس کے کئی معانی ہیں ایک لفظی (لغوی) معنی تیز رفتار ہے، لہذا فاسٹ ٹرین کا ترجمہ تیز رفتار ٹرین صحیح ہے، لیکن FAST LIFE کا ترجمہ تیز رفتار زندگی غلط ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ فضول خرچ زندگی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلے تو انگریزی کے فاسٹ لائف کا ترجمہ غلط ہوا، پھر اسی مفہوم میں ہندستان میں انگریزی کی ترکیب فاسٹ لائف کا استعمال ہونے لگا، اور اب اوسط تعلیم یافتہ لوگوں میں فاسٹ لائف کا مطلب ہوتا ہے تیز رفتار زندگی۔

اسی طرح فاسٹ کلر کا ترجمہ معیاری اور قدیم اردو میں پکا رنگ اور فاسٹ فرینڈ کا ترجمہ گہرا دوست ہوتا تھا۔ لیکن اب عام طور پر فاسٹ کلر کا ترجمہ تیز رنگ اور فاسٹ فرینڈ کا پکا دوست۔ اسی طرح لاؤڈ اسپیکر کا مطلب اونچی آواز میں بولنے

والا نہیں بلکہ اسکا مطلب ہے وہ آلہ جس سے آواز تیز اور اونچی ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے، ترجمہ کرتے وقت اسکا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ مثلاً انگریزی لفظ CLEVER ہے، اس لفظ میں انگریزوں کے نزدیک کوئی ذم کا پہلو نہیں، بلکہ تعریف اور توصیف کا پہلو ہے۔ اس کے معنی ہیں ہوش مند، صاحب فراست، عاقل، لیکن اردو میں جب اسکا ترجمہ چالاک کیا جاتا ہے تو ہر چند کہ ترجمہ صحیح ہے مگر مفہوم غلط ہو جاتا ہے۔ اس لیئے کہ اردو میں لفظ چالاک میں ذم کا پہلو ہے۔ دراصل چالاک کے معنی کا تعین کرنے میں بچپن میں پڑھی اور سنی جانے والی چالاک لومری کی کہانی کا بڑا ہاتھ ہے۔

ہندستان مین لومری کو مکار سمجھا جاتا ہے، اس کی ہوشیاری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، جبکہ انگلینڈ میں لومری کی ہوشیاری کو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس تفاوت کا سبب ہے مشرقی اور مغربی جغرافیہ اور اقدار کے تحت پرورش پانے والا معاشرتی اقدار۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں لومری کا طریقہ کار برا نہیں بلکہ اچھا ہے جبکہ مشرق میں یہ طریقہ کار غیر مستحسن ہے۔

ہندستانی چالاک کا انگریزی مفہوم ہوگا CUNING۔

اسی طرح DOCUMENTRY فلم کا ترجمہ دستاویزی فلم بظاہر درست ہے اور اب بکثرت مستعمل بھی ہے مگر یہ ترجمہ درست نہیں درست ترجمہ ہوگا واقعاتی یا اسنادی یا وثاقی۔

اسی طرح کیوری ایس کا ترجمہ عجیب نہیں بلکہ انوکھا ہونا چاہیئے مگر اردو میں اسکا ترجمہ عام طور پر عجیب کرتے ہیں۔

اسی طرح DO NOT KNOW BLACK FROM WHITE کا ترجمہ کالے سے سفید نہیں جانتے غلط ہے، صحیح ترجمہ ہے کالے اور سفید کا فرق نہیں جانتے۔

ATTEMPT ON LIFE کا ترجمہ زندگی پر کوشش غلط ہوگا اس کا

درست ترجمہ ہوگا قاتلانہ حملہ۔

اسی طرح WHEAT AND WHEAT PRODUCTS کا ترجمہ گیہوں اور اس کے مشتقات نہیں بلکہ گیہوں سے بنی چیزیں ہونا چاہیئے۔

HE IS STANDING IN THE SUN کا صحیح ترجمہ ہے وہ دھوپ میں کھڑا ہے یا وہ دھوپ میں کھڑا ہوا ہے، اگر اس کا کوئی سورج میں کھڑا ہے ترجمہ کرتا ہے تو چاہے لفظی اعتبار سے وہ کتنا بھی درست ہو ترجمہ غلط ہوگا۔

اب انگریزی کا مندرجہ ذیل جملہ ملاحظہ کیجئے۔

I AM TO GO اس کا ترجمہ ہوگا میں جانے والا ہوں یا میں جانے کو ہوں۔ حالانکہ یہ دونوں جملے اردو کی معیاری زبان کے مغائر ہیں مگر اب اردو میں بھی انگریزی طرز گفتگو کو معیوب نہیں سمجھتے۔

انگریزی کا جملہ ہے SHE IS TO DANCE اور اسی زبان کا ایک اور جملہ ہے SHE IS A DANCER ان دونوں جملوں کے مفہوم میں فرق ہے پہلے جملے کا مطلب ہے اب وہ ناچ شروع کریگی، اور دوسرے جملے کا مطلب ہے وہ رقاصہ ہے۔ انگریزی کے جملے مین حرف A ہے، لیکن اردو میں اس A کا ترجمہ نہیں کیا گیا، اس لیئے کہ اس کا ترجمہ اردو کے مزاج کے خلاف ہوتا۔ اردو میں یہ کہنا کافی ہے کہ وہ رقاصہ ہے۔ اگر اردو میں کہا جائے کہ وہ ایک رقاصہ ہے تو گرچہ ترجمہ صحیح ہوگا مگر اردو کے مزاج کے خلاف ہونے کی وجہ سے اچھا ترجمہ نہیں کہا جائے گا

انگریزی جملہ ہے SHE IS TO DANCE TOMORROW اس کا اردو ترجمہ ہے وہ کل ناچنے والی ہے، لیکن یہ ترجمہ صحیح ہوتے ہوئے بھی صحیح نہیں اس کا مطلب ہے وہ کل ناچے گی۔

اسی طرح ایک اور جملہ ہے SHE IS TO DANCE WELL اس کا اردو ترجمہ بالعموم یہی ہوتا ہے وہ اچھی طرح ناچنے والی ہے۔ لیکن یہ ترجمہ بھی درست ہونے کے باوجود فصیح نہیں۔ اس کا فصیح ترجمہ ہے وہ اچھی طرح ناچے گی۔

اب انگریزی کا ایک اور جملہ ملاحظہ ہو HE HAS A PEN اسکا اردو ترجمہ ہے وہ قلم رکھتا ہے یا اس کے یہاں قلم ہے لیکن بالعموم اسکا ترجمہ ہوتا ہے اسکے پاس قلم ہے، یا اس کو قلم ہے۔ اولاول الذکر دونوں ترجمے فصیح ہیں لیکن اب آخرالذکر جو غیر فصیح ہے فصیح بن گیا ہے۔

انگریزی کا جملہ ہے I AM GOING اس کا اردو ترجمہ ہے۔ میں جا رہا ہوں انگریزی زبان کے قائدے کے مطابق I ایک حرف ہے لیکن مذکورہ جملے میں یہ لفظ بن گیا ہے جسکا نام ہے پروناؤن، یعنی ناؤن کا بدل۔ اس بدل کا استعمال اس لئے ہوتا ہے کہ اگر جملے میں بار بار نام کا استعمال ہو تو جملہ بھدا ہو سکتا ہے۔ اس بھدے پن سے بچنے کے لیئے پروناؤن (ضمیر) کا استعمال ہوتا ہے۔

انگریزی زبان کے قائدے کے مطابق ناؤن یا پروناؤن بدلتے نہیں یعنی بشیر ہمالیہ ہندستان یا میں، تم آپ، ماضی حال مستقبل تینوں میں یکساں رہتے ہیں۔

اردو زبان کے قائدے کے مطابق ''میں'' کوئی حرف نہیں، لفظ ہے اور یہ لفظ ضمیر ہے یعنی اسم (نام) کا بدل اور ضمیر کے استعمال کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسم کے بار بار استعمال سے جملے میں جو بھدا پن پیدا ہوتا ہے اس سے بچا جائے۔

چونکہ انگریزی زبان اور اردو زبان کے قوائد I یا میں کے معاملے میں تقریبا یکساں ہیں اس لئے خاص نام یا ضمیر کا ترجمہ نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اوقات خاص نام کا ترجمہ بھی ہوتا ہے مثلاALEXENDER کو اردو میں ایلکزنڈر کہنا چاہئے اور یہی ہوتا بھی ہے، لیکن مقدونیہ کے مشہور بادشاہ جس نے دنیا کے کئی حصوں پر حملہ کر کے اسے جیتا اسے انگریزی میں ایلکزنڈر کہتے ہیں لیکن اردو میں اسے ایلکزنڈر نہیں بلکہ سکندر یا اسکندر کہتے ہیں۔ اسکندر یا سکندر ایلکزنڈر کی بگڑی ہوئی شکل ہے یعنی معرب ہے۔ چونکہ ہمارے ملک پر عرب اور پھر عربی کے زیر اثر زبان بولنے والوں نے صدیوں حکومت کی اور ان کے زیر اثر جدید ہندستانی زبانون نے ترقی کی اس لئے ہندستانی زبانوں میں بھی ایلکزنڈر کا ترجمہ سکندر کیا جاتا ہے۔ لیکن برطانیہ کی شہزادی

ایلکزنڈریہ کو ہم شہزادی اسکندریہ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ روایت یا چلن میں اسکندریہ سکہ رائج نہیں بن سکا چونکہ ترجمے میں پڑھنے اور سننے والوں کی نفسی کیفیت کا بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے اور اپنی روایات کے معروف طریقوں کا بھی اس لئے برطانیہ کی شہزادی ایلکزنڈریہ کا ترجمہ ہم اسکندریہ نہیں کر سکتے۔

ان باتوں کا دھیان نہیں رکھنے کی وجہ سے ایک موقر اخبار میں شہزادی ایلکزنڈریہ کا ترجمہ اسکندریہ کیا گیا تھا۔ لیکن اس ترجمے کو ہم بہرحال غلط نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ لفظ ایلکزنڈریہ کا تعلق کسی نہ کسی طور پر اس معروف بادشاہ سے ہے جس کے نام کا ترجمہ ہم اسکندریہ کرتے ہیں۔ لیکن بہتر ہوتا اگر ہم ایلکزنڈریہ ہی لکھتے۔

ابھی تک اردو میں موارد یعنی اردوانے کے چلن نے ترقی نہیں کی ورنہ بہتر ہوتا کہ ہم ایلکزنڈریہ کے صوتی تنفر سے بچنے کے لئے اسے اے لک زندریہ کہتے، مذکورہ لفظ کا صوتی تنفر انگریزی میں نہیں، اردو میں ہے، اس لئے کہ صوتی تنفر کا تعلق اردگرد کے دوسرے الفاظ کی صحبت اور سے پیدا آہنگ اور نفسی کیفیت سے ہے۔

اب جملے کے دوسرے جزو یعنی AM GOING کے ترجمے کا معاملہ لیجئے۔ یہاں AM مددگار فعل ہے اور GOING فعل ہے اور GO سے بنا ہے، جسکا مطلب ہے جانا جاؤ، جاتا ہے۔ GO میں ING کا اضافہ AM کی وجہ سے ہے۔ اس جملے سے ظاہر ہے کہ جانے کا کام ختم نہیں ہوا، یعنی زمانہ موجود میں یہ کام جاری ہے، لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کام بہت دنوں سے جاری ہے۔

اردو جملے میں ''جارہا ہوں'' فعل ہے۔ اصل اور بنیادی فعل ہے۔ جانا، اس سے جاتا، جاؤ اور گیا وغیرہ بنتے ہیں۔ رہا ہوں قدیم اردو یا معیاری اردو کے روزمرہ کے خلاف ہے۔ لیکن آج کل جارہا ہوں کر رہا ہوں کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ اس لئے معیاری اردو کے خالص پسند زبان دانوں کے نزدیک میں جارہا ہوں غلط جملہ ہے لیکن اس کے باوجود صحیح جملہ ہے۔ اور انگریزی زبان کے جملے I AM GOING کی درست ترجمانی کر رہا ہے۔ لہذا خالص اردو داں کے نزدیک غلط

زبان ہوتے ہوئے بھی درست ترجمہ ہے۔ لیکن بہتر ہوتا کہ اس کا ترجمہ ہم اس طرح کرتے ''میں جاتا ہوں'' اس لئے کہ اردو روزمرہ کے مطابق ''میں جاتا ہوں'' میں ''مین جارہاہوں'' کا مفہوم شامل ہے اور لفظ رہا کا استعمال بالکل غیر ضروری ہے۔

اور اب انگریزی کے ایک اور جملہ کو پیش نظر رکھئے I GO اس کا ترجمہ ہے ''میں جاتا ہوں'' اگر اس سے پہلے MAY کا اضافہ کردیا جائے تو مطلب ہوگا کیا میں جاسکتا ہوں؟ یا کیا میں جاؤں یا مجھے جانے کی اجازت ہے؟ یا کیا مجھے جانے کی اجازت ہے؟ گیا جملہ تو ایک ہے لیکن اسکا ترجمہ مختلف حالات اور سیاق وسباق کو دیکھتے ہوئے مختلف ہوگا۔

اسی طرح ایک جملہ ہے CAN I GO اسکا مطلب بھی وہی ہے جو MAY I GO کا ہے۔ مگر لفظ MAY اور CAN کے معنوں اور محل استعمال میں تھوڑا فرق ہے، اسے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

بعض جملوں کا ترجمہ تو بالکل الٹا ہوتا ہے تبھی اس کا سیدھا مفہوم سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی کا جملہ ہے I GIVE EXAMINATION اسکا سیدھا ترجمہ ہوگا میں امتحان دیتا ہوں، لیکن دراصل یہ ترجمہ بالکل اُلٹا ترجمہ ہے۔ یہاں Give کے معنی دینا نہیں ، لینا ہے۔ اسی طرح Take Examination کا ترجمہ ہونا چاہئے میں امتحان لیتا ہوں، لیکن یہ بھی اس کا اُلٹا ترجمہ ہے۔ صحیح ترجمہ ہوگا، میں امتحان دیتا ہوں۔ اس لئے کہ یہاں Take کے معنی لینا نہیں بلکہ دینا ہے۔

حسب بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ ترجمہ کاری بہت مشکل ہے بظاہر یہ عمل آسان نظر آتا ہے اور یہ ضروری ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہو اور جس زبان میں ترجمہ ہورہا ہو دونوں سے مترجم چاہے اچھی طرح واقف نہ ہو مگر زبانوں کا مزاج شناس ہو اور اچھی سُوجھ بُوجھ اور تجربہ رکھتا ہو۔ الفاظ اور اس کی نشست وبرخاست اور آہنگ سے آشنا ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا

ہے اس زبان سے مترجم اچھی طرح واقف نہیں ہوتا لیکن اچھی سُوجھ بُوجھ اور اس زبان کا اچھا مزاج شناس ہوتا ہے جس میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں بھی نتیجہ ٹھیک ہوتا ہے بلکہ اگر مترجم کئی زبانوں سے اچھی طرف واقف ہے چاہے وہ اس زبان سے اچھی طرح واقف نہ ہو جس میں یا جس سے ترجمہ ہو رہا ہے تو بھی وہ عمدہ ترجمہ کر لیتا ہے۔ اس کی مثال ڈپٹی نذیر احمد کا وہ کارنامہ ہے جسے ''تعزیراتِ ہند'' کا نام دیا گیا ہے۔

جب نذیر احمد نے انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ ضابطہ تعزیراتِ ہند کے نام سے شروع کیا تو انہیں انگریزی زبان سے واقفیت نہ تھی بس شُد بُد تھی۔ مگر انگریزی، اُردو ڈکشنری کی مدد سے انہوں نے جو ترجمہ کیا ہے اور جو اصطلاحات ایجاد کی ہیں وہ آج تک لاثانی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ ترجمہ کے لئے غور و فکر اور کئی زبانوں پر عبور ہو تو چاہے زیرِ ترجمہ زبان سے کم واقفیت ہو تو بھی آدمی اچھا ترجمہ کر سکتا ہے۔

اب مندرجہ ذیل جملہ کا اردو ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

I Have to go مجھے جانا ہے، مجھ کو جانا ہے، میں جانے والا ہوں۔

I will have to go مجھ کو جانا پڑے گا، مجھے جانا ہوگا۔

I had to go مجھے جانا پڑا۔

He had to be killed اسے قتل کر دینا پڑا۔

I have to live مجھے رہنا پڑتا ہے۔

اور اب چند اور جملے ملاحظہ ہوں:۔

If Ram comes I should give him a prize اس کا ترجمہ ہے۔ اگر رام آئے تو میں اسے انعام دوں۔

لیکن اس کا لفظی ترجمہ اس طرح ہوگا ''اگر رام آیا مجھے جسے انعام دینا چاہئے'' مگر یہ ترجمہ درست نہیں ہوگا۔

انگریزی جملہ ہے:۔ Were I rich, I should help you اس کا

لفظی (مکھی پر مکھی انداز میں) ترجمہ ہونا چاہئے۔ ''اگر میں امیر ہوتا تمہاری مدد کرنی چاہئے تھی''۔ مگر یہ درست ترجمہ نہیں۔ اس کا درست ترجمہ ہے اگر میں امیر ہوا تو تمہاری مدد کروں گا، یا اگر میں امیر ہوؤں تو تمہاری مدد کر دوں۔

انگریزی جملہ ہے۔

If ram had come, I should have given, him prize

لفظی ترجمہ ہونا چاہئے۔ اگر رام آیا تھا مجھے اسے انعام دینا چاہئے تھا۔ مگر درست ترجمہ ہے۔ اگر رام آیا ہوتا تو میں نے اسے انعام دیا ہوتا۔

انگریزی جملہ ہے:۔ He may (or might) have gone لفظی ترجمہ ہے ہوسکتا ہے وہ گیا ہے۔ مگر دُرست ترجمہ ہے۔ وہ گیا ہوگا۔

انگریزی جملہ ہے:۔ He must have gone لفظی ترجمہ ہے۔ وہ ضرور گیا ہو۔ لیکن درست ترجمہ ہے۔ وہ ضرور گیا ہوگا۔

انگریزی جملہ ہے:۔ You must have read the book لفظی ترجمہ ہے۔ تم نے ضرور کتاب پڑھی ہے۔ مگر درست ترجمہ ہے۔ تم نے ضرور کتاب پڑھی ہوگی۔

انگریزی جملہ ہے:۔ I should have gone there درست ترجمہ ہے۔ مجھے جانا چاہئے تھا۔

اسی طرح انگریزی جملہ ہے:۔ Were I a king لفظی ترجمہ ہے۔ میں راجہ تھا مگر درست ترجمہ ہے۔ اگر میں راجہ ہوتا۔ انگریزی جملے ہیں۔

May I see you

Might I see you

Could I see you

مگر ان کا اُردو ترجمہ ہوگا۔ کیا میں آپ سے مل سکتا ہوں۔ حالانکہ لفظی ترجمہ ہوگا۔ کیا میں آپ کو دیکھ سکتا ہوں۔

انگریزی جملہ ہے:۔

I request you to grant me leave

I would request to grant me leave

دونوں کا ترجمہ ہوگا۔ میں آپ سے چھٹی کی منظوری کا خواستگار رہوں۔ جب کہ لفظی ترجموں میں اختلاف ہوگا اور بھدا اپن بھی۔

انگریزی جملہ ہے:۔ I saw him go or going لفظی ترجمہ ہے میں نے دیکھا اسے جاتے ہوئے۔ درست ترجمہ ہے۔ میں نے اس جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن آخر الذکر کا انگریزی میں ترجمہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے:۔ I sow him when I was going مگر اس کا مفہوم مختلف ہے۔

حسب بالا باتوں سے ظاہر ہے کہ ترجمے کا محض زیر ترجمہ زبان یا جملوں کے الفاظ کے لغوی یا اصطلاحی معنوں پر ہی انحصار نہیں ہوتا بلکہ وسباق، پس منظر، مزاج وغیرہ سے بھی اس کا تعلق ہوتا ہے، اور اس بات کو پیش نظر رکھ کر ہی اچھا اور ''صحت مند'' ترجمہ ہوسکتا ہے۔

عام اور کاروباری زبان کا ترجمہ نسبتاً آسان ہوتا ہے مگر علمی زبان کا ترجمہ مشکل تر ہوتا ہے اور علمی زبان بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ قدرتی علوم۔ طبیعات و حیاتیات کی زبان۔ سماجی علوم یعنی سیاسیات، سماجیات، معاشیات، نفسیات، لسانیات، صوتیات، جغرافیہ وغیرہ کی زبانیں اور انسانی علوم یعنی فلسفہ، تاریخ، فنون لطیفہ اور ادبیات کی زبانیں الگ الگ ہوتی ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے والی بنیادی چیز ہے ان زبانوں میں استعمال ہونے والی اصطلاحیں۔ دراصل علمی زبان (جس میں ادبیات بھی شامل ہیں) میں اصطلاحوں کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے اس لئے کہ اصطلاح معنی کو متعین ومحدود انداز میں پیش کرنے کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ اصطلاح کی وجہ سے اختصار اور ایجاز پیدا ہوتا ہے اور معنی بھی نسبتاً متعین ہوجاتے ہیں اور اس لئے علمی زبان کی تحریری اور تقریری صورتوں کا استعمال

کرنے والا چاہے بولنے یا لکھنے والا ہو یا سُننے والا ایک خاص طرح کے ''اشارے'' وضع کر لیتا ہے جو عام لغت سے مختلف معنوں کے حامل ہوتے ہیں۔

علمی زبان میں ادبیات بھی شامل ہیں لیکن ادبیات میں انشاء فکشن، مکالمے اور ڈرامے (یعنی اعمال کا بیان) کا ترجمہ قدرتی علوم کے ترجمے کی بہ نسبت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔

وہ حصہ آسان ہے جہاں معنی کی سطح ابھری ہے جہاں ''مفہوم کا اظہار'' منطقی ترتیب یا موزوں تریں الفاظ کی قید سے وابستہ نہیں ہے، لیکن وہ حصہ جہاں تخیل کی کارفرمائی ہے ـــ رمز و ایما، استعارے، تشبیہ کا استعمال اور تلمیح سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تاریخی حوالوں اور اشاروں اور کنایوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کوئی معنوی ذہنی ہے یعنی ماورائے سخن بھی کوئی بات ہے اور لفظ گنجینہ معنی کا طلسم ہے۔ وہاں ادبیات کا ترجمہ مشکل تر ہوتا ہے اس لئے کہ بعض اوقات الفاظ ہیرے کی طرح کثیر پہلو اور زندگی کی طرح ہزار رنگ ہوتے ہیں جن کو گرفت میں لانا مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایہام یا ذومعنی الفاظ کا جب جب استعمال ہوتا ہے تو پھر اس طرح کے حصے کا ترجمہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً سر والٹر اسکاٹ کے ڈرامہ ''آئیون ہو'' کے مندرجہ ذیل حصے کا ترجمہ ملاحظہ ہو

''وہ دیکھو دولت مند یہودی ان مفلس کتوں سے جگہ کے لئے دھکم دھکا کر رہا ہے جن کے خستہ لبادوں کی جیبوں میں ایک کراس (سکہ) بھی نہیں جو ابلیس کو وہاں ناچنے سے روک دے۔

کراس سکّے کا نام بھی ہے اور نشان مقدّس (صلیب) بھی جسے دیکھ کر ابلیس بھاگ جاتا ہے۔ اور ابلیس کا ویرانے میں قیام ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں اس کے بین سطور میں ہیں۔ ترجمہ میں ان کا دھیان رہنا چاہے۔

دراصل کاروباری زبان یا گفتگو یا خط و کتابت، خبر یا رپورٹنگ کا مقصد بالعموم یہی ہوتا ہے کہ حقیقی مفہوم ایک زبان سے دُوسری زبان میں منتقل ہو جائے۔ بالعموم

سیدھے سادے خیالات اور فوری مطالب کو سادگی سے ادا کرنے کی کوشش ہی مترجم کا نصب العین ہوتی ہے۔

جب کہ علمی زبان زیادہ منطقی اور دُرست تر ہوتی ہے لیکن اس کی ترسیل یا انتقال کا کام دوسری زبان میں اس لئے مشکل ہے کہ ہر زبان کی اصطلاحات اپنی انفرادیت رکھتی ہیں اور اس لئے ایک اصطلاح کا دوسری اصطلاح میں ترجمہ بہت دشوار ہوتا ہے۔ اور خاص طور پر انگریزی سے اُردو یا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ اس لئے دشوار تر ہے کہ انگریزی ان ملکوں کی زبان ہے جہاں کا جغرافیہ ہندوستان کے جغرافیہ سے بہت مختلف ہے بلکہ متضاد ہے اور خود انگریزی اصطلاحات سازی میں اطالوی یا یونانی لفظیات کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ زیادہ تر اصطلاحات اس نظام یا حقیقت یا دریافت یا انکشاف کا اشاریہ ہوتے ہیں جو انگریزوں نے معلوم یا وضع کیے ہیں۔ بعض اوقات مفروضات اور مجرد تصورات کو اصطلاح بند کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں ترجمہ اور مشکل ہو جاتا ہے۔

ترجمہ اور لفظ کاری

عصری علوم میں تیز رفتاری سے اضافہ کی وجہ سے ترجمے کی افادیت دو چند ہو گئی ہے۔ ترجمہ کاری کے لئے اصطلاح سازی اور نئے الفاظ بنانے کی ضرورت بھی ناگزیر ہے۔ لہٰذا لفظ کاری کے تعلق سے چند اصولی باتیں پیش خدمت ہیں۔ گردش زمانہ کے ساتھ الفاظ تغیر و تبدل کا شکار ہوتے ہیں۔ فنا ہوتے ہیں اور جنم لیتے ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو ضرورت اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ نئے لفظ، نئی ترکیبیں اور نئی اصطلاحات بنائی جائیں۔

ادب اور فن کے ماہر زیادہ تر غیر شعوری طور پر نئے لفظ، نئی ترکیبیں اور اصطلاحات تراشتے ہیں۔

ان کے علاوہ علمی کام کرنے والوں اور بالخصوص علمی تصنیف و تالیف یا ترجمہ کے پیشے میں مصروف لوگوں کو شعوری طور پر نئے لفظ، نئی ترکیبیں اور نئی اصطلاحات بنانے (گھڑنے) کی ضرورت پڑتی ہے یہ لفظ تراشی کبھی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اور کبھی بے اصولے پن سے کی جاتی ہے۔

پیش نظر مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ نئے لفظ، نئی ترکیبیں اور نئے اصطلاحات بنانے کے چند اصولوں سے بحث کی جائے تا کہ علمی تصنیف و تالیف (ترجمہ) میں مصروف لوگوں کو اپنے کام میں مدد مل سکے۔

اردو قواعد کے مطابق مندرجہ ذیل اصولوں کے تحت نئے لفظ بنائے جاتے

ہیں۔

اصول نمبر 1۔ کسی لفظ سے پہلے کوئی صفتی لفظ لگا کر جو نیا لفظ (اسم صفت) پہلے لایا جاتا ہے اسے 'سابقہ' کہتے ہیں۔ مثلاً

از۔لگا کر۔از + حد

بر۔لگا کر۔بر + وقت۔بروقت

با۔لگا کر۔با + اثر = بااثر

بے۔لگا کر۔بے + حساب = بے حساب

بہ۔لگا کر۔بہ + حال = بحال

سخت۔لگا کر = سخت + جان = سخت جان

کم۔لگا کر = کم + بخت = کم بخت

ایک۔دو تین یا اسی طرح کا کوئی لفظ لگا کر

مثلاً۔ یک + لخت = یکلخت

۔دو + دل = دودل

تین کا مخفف تی + رنگ۔ ترنگ

چار کا مخفف پنج + رنگ۔ پنج رنگ

مثلاً سہ + رنگ = سہ رنگ

صد + رنگ = صد رنگ

دو + نیم + دونیم

یک + رنگ = یک رنگ

ازیں قبیل۔

بلند لگا کر۔ بلند + نظر = بلند نظر

تر۔لگا کر۔ تر + دماغ = تر دماغ

خوب۔لگا کر۔ خوب + رو = خوبرو

پا-لگا کر- پا- مال= پامال

پر-لگا کر- پر+ جوش= پر جوش

تہ- لگا کر- تہ+دار= تہہ دار

وال-لگا کر- مثلاً کوت+وال= کوتوال

والا-لگا کر- مثلاً- رکھ+والا= رکھوالا

وان-لگا کر- مثلاً- ڈھل+وان= ڈھلوان

ورا-لگا کر- مثلاً- چٹ+ورا= چٹورا

ونی-لگا کر- مثلاً- مل+ونی= ملونی

ہ-لگا کر- مثلاً- ہرکار+ہ= ہرکارہ

ہارا اور ہارا-لگا کر- مثلاً- لکڑ+ہارا= لکڑہارا

ہٹ-لگا کر- مثلاً- نیلا+ہٹ= نیلاہٹ

ہرا-لگا کر- مثلاً- دو+ہرا= دوہرا

ی-لگا کر- مثلاً- تھاپ+ی= تھاپی

یالگا کر- مثلاً- کھٹ+یا= کھٹیا

یا-رلگا کر- مثلاً- ہتھ+یار= ہتھیار

یانا-لگا کر- مثلاً- کھس+یانا= کھسیانا

یرا-لگا کر- مثلاً- لٹ+یرا= لٹیرا

یلا-لگا کر- مثلاً- رس+یلا= رسیلا

یل-لگا کر- مثلاً- نک-+یل= نکیل

بر-لگا کر- مثلاً- نام-بر= نام بر

بردار-لگا کر- مثلاً- چلم+بردار= چلم بردار

بند-لگا کر- مثلاً- ازار+بند= ازار بند

بستہ-لگا کر- مثلاً- کمر+بستہ= کمر بستہ

پرس ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ باز + پرس = باز پرس

پرست ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ صورت + پرست = صورت پرست

پرور ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ بندہ + پرور = بندہ پرور

پسند ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ دل + پسند = دل پسند

پوش ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ سبز + پوش = سبز پوش

تر ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ کم + تر = کم تر

تراش ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ قلم + تراش = قلم تراش

جو ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ جنگ + جو = جنگ جو

چہ ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ صندوق + چہ = صدوقچہ

چین ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ گل + چین = گل چین

خوار ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ نمک + خوار = نمک خوار

خواہ ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ خاطر + خواہ = خاطر خواہ

دار ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ تحصیل + دار = تحصیلدار

الف اور ت ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ معلوم + ات = معلومات

الف اور ر ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ رفت + ار = رفتار

الف اور را ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ جہاں + آرا = جہاں آرا

آزما ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ قسمت + آزما = قسمت آزما

افزا ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ روح + افزا = روح افزا

اک ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ پوس + اک = پوساک

آلود ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ خون + آلو = خون آلود

آمیز ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ درد + آمیز = درد آمیز

انداز ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ خلل + انداز = خلل انداز

اندیش ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ دور ـ اندیش = دوراندیش

انگیز ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ درد + انگیز = دردانگیز

از ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ مرد + انہ = مردانہ

انی ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ روح + ان = روحان

آور ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ زور + اور = زوراور

بار ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ گران + بار = گراں

باز ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ آتش + بار = گراں بار

بان ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ اتھ + بان = اتھ

وان ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ اتھ + وان = اتھ وان

بخش ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ صحت + بخش = صحت بخش

دان لگا کر ۔ مثلاً ۔ قدر + دان = قدردان

دان ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ عطر + دان = عطردان

راں ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ حکم + ران = حکمران

رساں ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ خبر + رساں = خبرساں

رو/روں ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ گرم + رو = گرم رو

زادہ ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ امیر + زادہ = امیرزادہ

زن ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ تیغ + زن = تیغ زن

سار ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ خاک + سار = خاکسار

ساز ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ جلد + ساز = جلدساز

ستان ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ ہند + ستان = ہندستان

سرا ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ نغمہ + سرا = نغمہ سرا

شکن ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ ہمت + شکن = ہمت شکن

شناس ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ رمز + شناس = رمزشناس

طلب ۔ لگا کر ۔ مثلاً ۔ آرام + طلب = آرام طلب

فرما۔لگا کر۔مثلاً۔ کرم۔ کرم= کرم فرما

افزا۔لگا کر۔مثلاً۔راحت +افزا=راحت فرا

فزا۔لگا کر۔مثلاً۔راحت +فزا=راحت فزا

فہم۔لگا کر۔مثلاً۔تیز +فہم=تیز فہم

کار۔لگا کر۔مثلاً۔پیش+ کار=پیش کار

کش۔لگا کر۔مثلاً۔جفا+ کشی=جفا کش

کش۔لگا کر۔مثلاً۔خود+ کشی=خودکشی

گار۔لگا کر۔مثلاً۔طلب+ گار=طلب گار

گر۔لگا کر۔مثلاً۔بازی+ گر=بازی گر

گرد۔لگا کر۔مثلاً۔آورہ+ گرد=آورہ گرد

گو۔لگا کر۔مثلاً۔حق+ گو=حق گو

گری۔لگا کر۔مثلاً۔باورچی+ گری۔باورچی گری

گیر۔لگا کر۔مثلاً۔جہاں+ گیر=جہاں گیر

مال۔لگا کر۔مثلاً۔پا+مال=پامال

مند۔لگا کر۔مثلاً۔حاجت+مند=حاجت مند

ناک۔لگا کر۔مثلاً۔غضب+ناک=غضب ناک

ندہ۔لگا کر۔مثلاً۔چر+ندہ=چرندہ

نشین۔لگا کر۔مثلاً۔خاک+نشین=خاک نشین

نگار۔لگا کر۔مثلاً۔نامہ+نگار=نامہ نگار

نما۔لگا کر۔مثلاً۔خوش+نما=خوش نما

نواز۔لگا کر۔مثلاً۔بندہ+نواز=بندہ نواز

وار۔لگا کر۔مثلاً۔قصور+وار=قصوروار

ور۔لگا کر۔مثلاً۔جانا+ور=جانور

ہ۔لگا کر۔مثلاً۔دست+ہ=دستہ

یات۔لگا کر۔مثلاً۔نظر+یات=نظریات

یت۔لگا کر۔مثلاً۔آدم+یت=آدمیت

ین۔لگا کر۔مثلاً۔شوق+ین=شوقین

ینہ۔لگا کر۔مثلاً۔دیر+ینہ=دیرینہ

یہ۔لگا کر۔مثلاً۔جبر+یہ=جبریہ

مترجم کومندرجہ ذیل حقائق پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔

1۔زبانیں علما سے زیادہ عوام بناتے ہیں۔علما اس کے قواعد معین کرتے ہیں۔ واحد کو جمع مذکر کو مؤنث اور اس کے برعکس کرنے میں عوام ہی پیش پیش رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پرانے الفاظ ختم ہوجاتے ہیں اور نئے در آتے ہیں مثلاً ''ریز گاری'' کی جگہ اب ''کھلا'' یا ''چلّر'' بولا جاتا ہے۔

2۔پٹھان کی زبان سے ''ح'' اور ترک کی زبان سے ''خ'' نہیں نکلتا۔یہ احمد کو اخمد اور وہ خانم کو حانم کہتا ہے۔

اس طرح انگریز کے منھ سے خ نکلنا اور فرانسیسی کی زبان سے ٹ نکلنا ناممکن سا ہے۔

3۔لفظ۔تسلی۔(پنجابیوں کے لئے) سیری، اطمینان، سکون اور اس کے علاوہ بھی کئی معنوں کا حامل ہے۔

4۔آگرے اور دہلی میں اصل لفظ کے پہلے حروف کو عموماً ''سے'' بدل دیتے ہیں مثلاً۔روٹی۔شوٹی۔گاڑی۔واڑی۔مگر پنجاب میں۔روٹی۔شوٹی۔گاڑی۔شاڑی۔

5۔بعض الفاظ کے معانی علاقائی اعتبار سے بدل جاتے ہیں مثلاً لفظ ''ساتھ'' پنجاب میں برابر کے معنوں میں بولتے ہیں۔فلاں صاحب ساتھ والے کمرے میں ہیں۔دکن میں ''جارہا ہوں'' یا ''جاتا ہوں'' کی جگہ ''جا کے آیا'' کا استعمال ہوتا ہے

''اور سربراہی'' کا لفظ ''فراہمی'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

6۔ دوسری زبانوں کے اثرات بھی اپنا کام کرتے ہیں مثلاً '' وہ میرا بڑا اچھا دوست ہے۔'' انگریزی ترجمہ ہے اردو میں اس کی جگہ۔ وہ میرا گہرا دوست ہے یا جگری دوست ہے بولنا چاہیے۔ مگر اب بڑا اچھا دوست کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔

خلیج بنگال، ملایا برما اور وہاں سے مشرقی بنگال نواکھالی اور چٹا گام کے شہروں اور دیہات میں عربوں کی آمد کے بہت سے آثار و علامات آج بھی پائے جاتے ہیں۔

بنگالی کوَدا۔ قدح کی مسخ صورت اور تیاتت۔ تفاوت کی صورت ہے۔

کتھائے۔ کجائے سے بنا ہے۔ بوشن۔ بہ نشیں۔ ہے۔ عین الناس۔ اناس ہے۔

ناریل۔ نارجیل ہے۔ اور نارجیل خود ناریل کا معرب ہے۔

بلہ گلا۔ حملہ اور غل ہے۔

موجم دار۔ معظم دار

کھندکور۔ خوندگار

کارپھورما۔ کارفرما

جامہ۔ لباس

درکار۔ ضرورت

کوکا۔ بردار خورد۔ ترکی دودھ شریک بھائی

کاکا۔ چچا۔ پشتو یا افغانی ہے معانی باپ کا بڑا بھائی پنجابی میں لڑکا ہے۔

چاکر۔ فارسی ہے

لالہ۔ پشتو۔ بڑا بھائی

بنگالی میں۔ چالیس فیصدی عربی فارسی الفاظ ہیں۔

بنگلہ میں چے کو سیں سے بدل دیتے ہیں۔ چانگام۔ شانگام

آسام بہار بنگال میں آنکھ کھل گئی کہ جگہ نیند کھل گئی کہتے ہیں۔

مہاراشٹر میں گناہ کا مطلب جرم ہے

تم وہاں نہیں گئے تھا نا؟ بہار کا مخصوص طرز کلام ہے۔ اس طرح بہار میں ''یہ'' کا طرز استعمال بھی عجیب ہے مثلاً نثار صاحب شریف صاحب کے ''یہ'' ہیں اسی طرح بہار میں مہک۔ بدبو کو بحال۔ تقرری کو۔ فرصت۔ رخصت کو کہتے ہیں اسی طرح بہار میں ''ہم'' کے ساتھ ''میں'' کا ستعمال عیب نہیں طرز تکلم ہے مثلاً ''ہم نے کہہ دیا تھا کہ میں بازار نہ جاؤں گا۔'' مشرقی یوپی والے، جن میں الہ آباد ہسوہ اور کان پور کے اضلاع شامل ہیں بہار کے ہم نوا ہیں۔ وہاں اِتا کا مطلب ہے اتنا ذرا سا

'تا کا مطلب ہے اتنا سارا

ہے ہی یوپی میں ہٹی ہے۔

بہار کا کڑوا۔ یوپی کا چرپرا ہے

دکن، برار ملک متوسط میں خ۔ اور قاف کا بول چال میں امتیاز نہیں ملتا۔ سی پی اور برار کی اردو میں بڑے بھیا گئے اور بڑی بھابی گئے بولتے ہیں اصل فعل کے ساتھ ایک اور فعل بھی بسا اوقات ہوتا ہے اسے انگریزی میں اوگزلری عربی میں فعل ناقص اور اردو میں امدادی فعل کہتے ہیں۔ ''مددگار فعل'' فقرے کے اصل فعل کا زمانہ متعین کرتا ہے۔ ''مثلاً بڑے بھیا بلا رہے ہیں'' بلا رہا فعل ہے۔ ''ہیں'' امدادی فعل برار اور سی پی میں کہتے ہیں۔

''ارے ہنڈیا میں نمک ڈالے کیا'' اور آیئے ہم آپ کو اپنا مکان بتائیں۔

الف ب واوران کا بدل (زبر) (زیر) (پیش)

مترجم کو اس اصول پر بھی دھیان رکھنا چاہئے کہ۔ الف اور ہائے ہوز (ہ) پر ختم ہونے والے الفاظ جب تصریفی حالت میں استعمال ہوں۔ یعنی جب اس صورت کے الفاظ ''میں''، ''پر''، ''تک'' سے ''نے'' کو'' یعنی حروف جار سے پہلے آئیں تو الف۔ یا ہائے ہوز کو تحتانی (ے) سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً۔

وہ گھوڑا پر سوار جارہا تھا۔ غلط ہے۔

گھوڑے پر سوار جارہا تھا۔ صحیح ہے

ہمارے محلّہ کا آدمی۔ غلط ہے

ہمارے محلّے کا آدمی۔ صحیح ہے۔

''ترجمہ کا فن'' غلط ہے۔ ''ترجمے کا فن'' درست ہے۔

عربی نحو میں آٹھ ابواب، گویا الفاظ وضع کرنے کے آٹھ سانچے ہیں۔ ہر باب سانچہ بھی ہے اور کسوٹی بھی، ان ابواب سے واقفیت، لسانی لیاقت و بصیرت میں متعدبہ اضافہ کرتی ہے۔

ان میں ایک باب استفعال بھی ہے، اس کے الفاظ اردو میں بہت رائج ہیں مگر اس کی خاصیت سے بہت سے پڑھے لکھے بھی ناواقف ہیں۔ اس کے پانچ خواص میں سے ایک خاصیت ''طلب'' بھی ہے۔ مثلاً فائدہ جب اس باب میں لایا جائے گا تو ''استفادہ'' ہوجائے گا اور مدد، ''استمداد'' اور معنی فائدہ چاہنا اور مدد چاہنا ہوجائیں گے۔ اس لیے اگر کوئی یہ کہے کہ استفادہ حاصل کیا اور استمداد چاہی تو یہ غلط ہوگا۔ استفادہ میں حاصل کرنے اور استمداد میں چاہنے کا مفہوم باب استفعال میں آنے کی وجہ سے موجود ہے۔ اس لیے استفادہ کیا اور استمداد کی'' لکھنا چاہیے۔

انس اور انسیت: انسیت غلط ہے مگر سوئے اتفاق سے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ یہ غلطی عالم اللسان کے مشہور مسئلے تشکیل بالتمثیل کے تحت ظہور میں آئی ہے۔

اسم صفت بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسم میں ''یت'' کا اضافہ کردیا جائے۔ جیسے آدمی سے آدمیت، فارسی سے فارسیت، اصلی سے اصلیت۔ ان تینوں موقعوں پر یائے تحتانی لفظ میں پہلے سے موجود ہے یعنی یہ کہ ''یت'' کا اضافہ آدمی، فارسی، اصلی میں کیا گیا ہے نہ کہ آدم، فارس، اور اصل میں۔ اس طرح صفت بن جانے کے بعد یائے تحتانی نے مشدد صورت اختیار کرلی۔

لیکن جو لفظ خود ہی اسم صفت ہو اس میں ''یت'' کا اضافہ اس لفظ کو لایعنی بنادے گا۔ ''انس'' خود اسم صفت ہے اس لیے اس میں کسی خارجی اضافے کی ضرورت نہیں لیکن چونکہ آدمی، فارسی، اصلی اور بہت سے دوسرے الفاظ کا جو صفات ہیں اسم صفت ''یت'' کے اضافہ سے بنایا گیا ہے اس لیے مماثلت کا فطری میلان اس میں بھی ''یت'' کے اضافے کی غیر شعوری ترغیب دیتا ہے۔ اور چونکہ عام بولنے والا لغات اور ان کی استعمال اور معنی کے رموز سے نابلد ہے اس لیے بہت جلد بھٹک جاتے ہیں۔

اندکورہ اصول کے تحت ''عریانیت'' بھی غلط ہے۔ عریانی خود اسم صفت ہے اور اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں جو مفہوم عریانیت سے ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ وہ عریانی سے پورا ہو جاتا ہے۔ اس کی تشکیل اس طور پر ہے کہ عریاں میں جو خود صفت ہے یائے تحتانی کا اضافہ کر کے عریانی اسم صفت بنالیا گیا ہے۔ مگر اب غلط ہونے کے باوجود اس لفظ کا دھڑلے سے استعمال ہوتا۔ اس لئے یہ درست ہو گیا ہے۔

کسی زبان میں ایک معنی کے دو لفظ نہیں ہیں جب ایک ہی معنی کے دو لفظ سامنے آئیں تو یقین کر لینا چاہئے کہ ان کے مفاہیم میں ہلکے اختلاف ضرور ہیں۔

''آرزو اور تمنا، حسرت اور ارمان، زلف، گیسو اور کاکل بظاہر ایک معنی کے لفظ سمجھے جاتے ہیں مگر ان میں فرق ہے۔ اسی طرح ''غرور'' اور ''غرہ'' میں فرق ہے۔ اسی طرح ''زیادہ'' اور ''زائد'' میں فرق ہے۔ دراصل ''زیادہ'' ''کم'' کی ضد ہے اور ''زائد'' معین اور مقررہ سے زیادہ کی۔ انگریزی میں زیادہ کے لیے More آتا ہے اور زائد کے لیے اڈیشنل۔

کھانے والا، دیکھنے والا اور سونے والا اور اسی قبیل کے دوسرے اسمائے فاعل فارسی قاعدے سے فاعل سماعی مندرجہ ذیل طریقے سے بولنا غلط ہے۔

(۱) بھائی کھانے والا تیل دیدو۔ (صحیح ہے۔ کھانے کا تیل دے دو)

(۲) سون پور کا میلہ تو دیکھنے والا ہے۔ (صحیح ہے دیکھنے لائق یا دیکھنے کا ہے)

(۳) ڈاکٹر صاحب نے سونے والا مکسچر دیا تو نیند آئی۔ (درست ہوگا۔ سونے کا مسکچر دیا۔ یا سونے کے لئے مکسچر دیا۔

نظر اور نظریہ: نظر بہ معنی خیال مثلاً آپ کس نظر سے یہ کہہ رہے ہیں۔ نظریہ بہ معنی ہائی پوتھیس یا تھیوری مثلاً ڈارون کا نظریہ کیا ہے۔ اسی طرح نظریہ اور نظری مین فرق ہے۔

تربینی میں جو گنگا، جمنا کے سنگم پر ہے گنگا اور جمنا کے پانی کے رنگ سے مختلف رنگ کا پانی نظر آتا ہے اسے روایت کے مطابق تیسرا دریا سمجھا جاتا ہے اس کا نام تربینی ہے تر سنسکرت ہے بہ معنی تین اور بینی عربی ہے۔

جس طرح دکن اور مدھیہ پردیش میں رخصت چاہتا ہوں یا اجازت چاہتا ہوں کی جگہ ''حاضر ہوتا ہوں'' استعمال ہوتا ہے اسی طرح کراچی میں اب اٹھانے کے معنی بدل گئے ہیں اٹھانا بہ معنی ''بٹھانا'' استعمال ہو رہا ہے۔

مثلاً ''میں بیس سے زیادہ سواری نہ اٹھاؤں گا۔'' اسی طرح ''کاٹنا'' موڑنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ☆☆☆

قومی اردو کونسل اور اصطلاح سازی

ترقی اردو بیورو (اب N C P U L) نے اردو کے فروغ کے لیے جو ہمہ جہت اقدامات کیے ہیں ان میں مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات سازی کا کام بھی شامل ہے۔ ابھی تک (۱) بشریات، (۲) نباتات، (۳) کیمیا، (۴) معاشیات، (۵) تاریخ، (۶) سیاسیات، (۷) لسانیات، (۸) فلسفہ، (۹) نفسیات، (۱۰) تعلیم، (۱۱) حیوانات، (۱۲) ریاضیات، (۱۳) انتظامیہ، و (۱۴) کامرس اور جغرافیہ کی فرہنگیں مکمل ہو چکی ہیں۔

زراعت، انجینئرنگ، جمادات، قانون، لائبریری سائنس اعداد وشمار، طب، صحافت، ترسیل عامہ، کمپیوٹرنکس اور پروگرامنگ کی اصطلاحی فرہنگیں تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں۔

قومی اردو کونسل کی اصطلاحات سائنٹفک اندازفکر کی حامل ہیں اور ملک بھر کے منفرد اور بیورو کے تکنیکی ماہرین کی برسوں کی فکروکاوش کا نتیجہ ہیں۔

اصطلاح سازی کی تاریخ میں بیورو کے کارنامے کا اچھی طرح اندازہ لگانے کے لیے اصطلاح سازی کے تاریخی پس منظر کا اجمالی جائزہ اور سابقہ اصطلاحات سے بیورو کی اصطلاحات کا تقابل مفید مطلب ہے۔

سینٹ جارج کالج مدراس، دلی کالج، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ عثمانیہ اور شمس لامرا کا دارالترجمہ وغیرہ نے اصطلاح سازی کے شعبے میں پیش رفت

کی اس کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف علاقوں مثلاً مہاراشٹر، کلکتہ اور بہار وغیرہ میں کئی ایسے ادارے قائم ہوئے جن میں ترجمے کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا اسی طرح کا ایک ادارہ سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور بہار میں تھا۔ جہاں 1841 میں ترجمے کا معاوضہ اتنا زیادہ تھا کہ لوگ ذوق وشوق سے ترجمہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں مترجم کے لیے کم سے کم تنخواہ ماہانہ 300 روپے تھی تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں بھی بڑے پیمانے پر اصطلاح سازی کا کام ہوا۔

اصطلاح سازی کے لیے وحیدالدین سلیم پانی نے باقاعدہ کتاب (وضع اصطلاحات) لکھی تھی ان کے اصول بہتر تھے لیکن کئی دہائیوں کی کاوش کے بعد اب یہ یقین ہو گیا ہے کہ بعض انگریزی اصطلاحات جو بولنے میں سہل ہیں اردو میں جوں کی توں لے لی جائیں۔ جب کہ وحیدالدین صاحب انگریزی اصطلاحات کو برقرار رکھنے کے سخت خلاف تھے۔

وحیدالدین سلیم پانی پتی نے جو اصول متعین کیے تھے ان سے بالعموم اردو کے وہ لوگ واقف ہیں جن کو اصطلاح سازی کے علم سے دلچسپی ہے۔ لہذا ان اصولوں کا ذکر کیے بغیر چند سطروں میں پاکستان میں اصطلاح سازی کے اصولوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی نے جو اصول وضع اصطلاحات مقرر کیے ہیں ان پر بالعموم متقدمین اور متاخرین دونوں کا اتفاق رہا ہے۔ یعنی

(۱) بین الاقوامی اصطلاحات کا جو دنیا کی تمام زبانوں میں بجنسہ، استعمال ہو رہی ہیں ترجمہ نہ کیا جائے۔

مثلاً کیمیا میں عناصر کی علامتوں کو حسب حال رہنے دیا جائے، آکسیجن کے لیے O نائٹروجن کے لیے N اور یورینیم کے لیے U وغیرہ۔ حیوانیات میں Order (فیصلہ) Genera (جنس) اور Species (نوع) کے لاطینی ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جائے مثلاً معمولی مکھی کا اصطلاحی لاطینی نام Musca domestica ہے، اردو میں بھی اس کو مسکا ڈومسٹیکا ہی کہیں گے۔ اسی طرح گلاب کے پھول کو روزار

نڈلیکا اور نیم کے درخت کو ایزاڈ کٹا کا انڈیا کہا جائے۔

(۲) اشیا اور ادویات کے ناموں کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے مثلاً پنسلین، گلوکوز وغیرہ قائم رہیں گے۔ جدید عناصر کے ناموں کا ترجمہ نہ کیا جائے اور مرکبات کے انگریزی نام بھی برقرار رکھے جائیں

(۳) جن مرکبات کے نام پہلے سے موجود ہیں وہ بھی برقرار رہیں گے مثلاً Iron کے لیے اردو میں لوہا قائم رہے گا لیکن Ferroas Sulphate کو اردو میں فیرس سلفیٹ اور عام زبان میں سبز توتیا کہیں گے Sodium کو اردو میں سوڈیم کہیں گے اور Sodium Chloride کو اصطلاحاً سوڈیم کلورائڈ اور عام زبان میں معمولی نمک کہیں گے۔

(۴) ریاضیات میں علامتوں اور ترقیمات کو بدلا نہیں جائے گا، بین الاقوامی علامتیں قائم رہیں گی۔

(۵) بقیہ تمام اصطلاحوں کا ترجمہ کیا جائے گا۔ اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ (الف) اصطلاح زبان اور فن کے لحاظ سے موزوں ہو، مختصر ہو، اور حتی الوسع اپنے معنی کے کل یا جز کی اس سے نمائندگی ہو۔

(ب) اصلاح سازی میں عربی، فارسی، ترکی، ہندوستانی، سنسکرت اور ان تمام زبانوں سے مدد لی جائے جو ہماری زبان کا جزو ہیں۔

(ج) ان بیرونی الفاظ کو بھی استعمال کیا جائے جو اردو زبان کے مزاج کے مطابق ہوں۔

(د) جو اصطلاحیں قدیم سے رائج ہیں، مفید اور موزوں ہیں برقرار ہیں۔

(ہ) اسماء سے افعال بلا تکلیف بنائے جائیں۔

(و) ضرورت ہو تو ہندوستانی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی کا جوڑ اور سابقے لاحقے لگائے جائیں۔

(ز) اردو اصطلاحات سازی میں ایک اصول بن گیا ہے Meter کے لیے

Scope کے لیے پیما Graph کے لیے نما Logy کے لیے نگار Old کے لیے یات، Ferous کے لیے ''سا'' Genous کے لیے بردار کے لیے زاد وغیرہ استعمال ہو رہا ہے اس کی پابندی کی جائے۔

ترقی اردو بیورو نے اصطلاح سازی کے لیے حسب ذیل رہنما اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

(۱) ایسی اصطلاحوں کو ترجیح دی جائے جو مروج یا مقبول ہو چکی ہیں چاہے اس میں کوئی لسانی یا معنوی سقم ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد معنوں میں مستعمل ہے تو ایسی صورت میں اس کے مختلف مفاہیم کو علیحدہ علیحدہ الفاظ/اصطلاح سے واضح کیا جانا چاہیے۔

(۳) اصطلاحوں اور عام الفاظ میں فرق کیا جانا چاہیے۔ عام الفاظ کو فرہنگ میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔

(۴) کون سا لفظ اصطلاح ہے اور کون سا محض ایک عام لفظ اس کا فیصلہ مضمون کے ماہرین کی رائے اور حسب ضرورت معیاری انگریزی لغات کی مدد سے کیا جانا چاہیے۔ اگر ایسی لغت میں کسی لفظ کے کوئی خاص معنی یہ کہہ کر دیے گئے ہیں کہ یہ معنی کسی فن یا کسی علم سے مخصوص ہیں تو اس فن یا علم کے مقاصد کے لیے اس لفظ کو اصطلاح تصور کیا جائے۔

جہاں تک ہو سکے، اصطلاح یک لفظی ہوں، ناگزیر صورتوں میں یہ دو لفظی بھی ہو سکتی ہیں۔ ایسی اصطلاحیں کم سے کم وضع کی جائیں جو دو سے زائد الفاظ پر مشتمل ہوں۔

(۵) جہاں تک ممکن ہو سکے ایک اصطلاح کا ایک ہی اردو متبادل دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ اصول نمبر 2 کے ذیل میں نہ آتا ہو۔

(د) ہندی اصطلاحوں کے اختیار کرنے کو (اگر ایسی اصطلاحیں اردو میں با آسانی تلفظ اور تحریر کی جا سکتی ہوں) عربی اصطلاحوں کے اختیار کرنے پر مراجع سمجھا

جائے۔

(٦) اگر کسی اصطلاح کو ایک سے زائد الفاظ کے ذریعہ ادا کرنے کی ضرورت پیش آئے تو حسب ذیل ترکیبات کو نیچے دی ہوئی ترتیب سے ترجیح دی جائے۔

(ا) وہ ترکیبات جن میں اضافت یا حرف ربط و جار قسم کی علامتیں نہ ہوں۔

(ج) وہ ترکیبات جن میں کا، کی، کے وغیرہ استعمال کیے گئے ہوں۔

(٩) اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد علم یا فن میں مشترک ہے اور ان سب علوم وفنون میں ایک ہی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا اردو متبادل بھی ہر جگہ ایک ہی رکھا جائے۔

(١٠) الفاظ کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادہ دلی ہونی چاہیے کہ ہندی، عربی، فارسی یا عربی فارسی۔ یا فارس عربی اور پراکرت ترکیبیں بھی قابل قبول ٹھہریں۔

(١١) اگر کوئی انگریزی اصطلاح مروج ہو اور عام فہم ہو تو اسے برقرار رکھا جائے ایسی عام فہم اصطلاحوں کے لیے اردو متبادل بنانے یا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

(١٢) اعلام کو ایسا ہی لکھا جائے جیسے کہ وہ اردو میں مقبول ہو چکے ہیں۔ البتہ ایسے اعلام جو ابھی مقبول نہیں ہوئے ان کو اردو ہجّی کے حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے ممکن صحت کے ساتھ لکھا جائے۔

(١٣) اگر کوئی علم کسی اصطلاح کا حصہ بن چکا ہے تو اس علم کا اصول نمبر 12 کی روشنی میں اردو ترجمہ کیا جانا چاہیے۔

علمی کتابوں کا ترجمہ کرتے وقت جن اصطلاحات کا انگریزی کا ترجمہ کرنا ہوتا ہے ان کے لیے کوئی ایک ہی متبادل مقرر کرنا مشکل ہے اس لیے کہ الفاظ اگر سیاق کے مطابق نہ ہوں تو جملہ چاہے قواعد اور لغت کی رو سے درست ہو مگر روزمرہ محاورے یا جمالیاتی تقاضوں کے مغائر ہو سکتا ہے لہٰذا مترجم کو موقع و محل کا بھی دھیان رکھنا چاہیے۔

جہاں تک اصطلاحات کو بطور لغت استعمال کرنے کا سوال ہے کوئی بھی فرد جو کسی انگریزی اصطلاح کا اردو متبادل تلاش کرنا چاہتا ہے۔ فرہنگ اصطلاحات سے اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن مترجم کی دشواری یہ ہے کہ اسے اس اصطلاح کو جملوں میں استعمال کرنا ہوتا ہے اور جملوں کا ماحول بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ لہذا مترجم کو اس طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

ایک خاص بات جس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ انگریزی اصطلاح سے زیادہ سے زیادہ متبادل دینے کی کوشش ہونی چاہئے۔ ترقی اردو بیورو اور پاکستان کے شعبہ ترجمہ نے زور دیا ہے کہ ایک انگریزی اصطلاح کا متبادل ایک اردو اصطلاح ہونا چاہئے۔ مگر عملی نقطۂ نظر سے یہ مستحسن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ترقی اردو بیورو نے Balance کا اردو متبادل ترازو اور کانٹا دیا ہے۔ اور ایک بہتر متبادل توازن چھوڑ دیا ہے جب کہ Balanced کے لیے متوازن استعمال کیا ہے۔ Basic کے لیے صرف ایک متبادل اساسی لکھا ہے اور بنیادی چھوڑ دیا Coin کے لیے سکہ لکھا ہے اور گھڑنا چھوڑ دیا ہے۔

شعبہ تالیف و ترجمہ کراچی نے بالعموم ایک ہی متبادل دیا ہے جب کہ بیورو نے ایک سے زیادہ متبادل دیے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کراچی کی فرہنگیں محدود ہو گئی ہیں۔ مثلاً Agent کے لیے صرف عمیل لکھا ہے عامل چھوڑ دیا ہے۔ Aggregation کے لیے صرف تجمیع دیا ہے اجتماع چھوڑ دیا ہے۔ Apology کے لیے صرف اشتہا دیا ہے بھوک چھوڑ دی ہے۔ Behaviour کے لیے صرف بیوہار دیا ہے برتاؤ چھوڑ دیا ہے Category کے لیے مقولہ دیا ہے درجہ چھوڑ دیا ہے Catharsis کے لیے تین اردو متبادل دیے ہیں مگر اہم ترین متبادل تزکیہ اور تطہیر چھوڑ دیا ہے۔ Cause کے لیے علت دیا ہے وجہ چھوڑ دیا ہے۔ Character کے لیے سیرت دیا ہے کردار چھوڑ دیا ہے۔ Communism کے لیے اشتمالیت لکھا ہے جب کہ اشتراکیت بھی ہونا چاہئے۔ Conception کے لیے صرف تعقّل لکھا ہے جب کہ تصور بھی

ہونا چاہیے۔Concrete کے لیے صرف ساکار لکھا ہے جب کہ ٹھوس بھی ہونا چاہیے Conflict کے لیے صرف تعارض لکھا ہے۔ جب کہ ٹکراؤ اور تصادم بھی ضروری ہیں۔ Confused کے لیے مرتبک لکھا ہے جب کہ الجھا ہوا بھی لکھنا چاہیے۔ اسی طرح Creterion کے لیے عیار اور محک لکھا ہے جب کہ معیار بھی ہونا چاہیے Idealism کے لیے تصوریت لکھا ہے جب کہ عینیت اور آدرش واد بھی چاہیے۔ یہ محض ایک سرسری نظر کا نتیجہ ہے۔ ورنہ غور وفکر کے بعد بے شمار اصطلاحات مل جائیں گی جو اردو میں مروج اور مستعمل ہیں۔ جن سے اردو کے لوگ مانوس ہیں جو عام فہم بھی ہیں۔

ترقی اردو بیورو کی اصطلاحات دارالترجمہ عثمانیہ اور پاکستان میں اصطلاح سازی اداروں کی کاوشوں سے بہت زیادہ بہتر اور معیاری ہیں۔ ☆☆☆

موازنہ سرور سلطانی اور شاہنامۂ اُردو

مرزا رجب علی بیگ سرور (1867) اپنی کتاب فسانہ عجائب کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کا ایک اور معروف کام سرور سلطانی ہے۔

سرور سلطانی، توکل علی بیگ حسینی کولابی، کی تصنیف، تاریخ دل کشائے شمشیر خانی کا اردو میں منثور ترجمہ ہے اس میں انہوں نے دیگر ماخذات کی مدد سے اضافے بھی کیئے ہیں۔

شمشیر خانی، فردوس طوسی، کی فارسی رزمیہ نظم شاہنامہ کی فارسی نثر میں تلخیص ہے جو توکل علی بیگ حسینی کولابی نے 1063 ہجری مطابق 1652 عیسوی غزنی کے حاکم شمشیر خاں کی فرمائش پر قلم بند کی تھی۔ توکل علی بیگ حسینی کولابی دارا شکوہ کی طرف سے کابل کا صوبہ دار تھا وہ غزنی کی امینی اور واقعہ نویسی پر بھی معمور کیا گیا تھا۔

شمشیر خانی بہت مشہور ہوئی 1805 میں منشی مول چند مستمند نے اس کا اردو میں منظوم ترجمہ مکمل کیا یہ ترجمہ سے زیادا اصل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے اس کا نام شاہنامہ اردو ہے۔

مول چند (منشی مستمند) کے بارے میں تذکروں میں سرسری ذکر ہے ان کا زمانہ 1833-1793 ہے۔ وہ نصیر کے شاگرد تھے قوم کے کایستھ تھے سخن ان کا عام پسند تھا انہوں نے ریختہ میں شمشیر خانی کا شاہنامہ اردو کے نام سے ترجمہ کیا تھا "ملازم سرکار شاہ عالم بادشاہ تھے۔ ان کے حضور قصائد مدحیہ پڑھتے تھے۔

منشی کا تذکرہ نہ صرف گارساں وتاسی کے یہاں ملتا ہے بلکہ باطن، ناصر، کریم، صہبائی، صابر، ذکا، قاسم، شیفتہ اسپرنگر کے یہاں بھی موجود ہے زیادہ تر

تذکروں میں اس کے تخلص مستمند کا ذکر نہیں ہے صرف ایک درسی کتاب جو فورٹ ولیم کالج سے چھپی تھی اس میں دوسرے شعرا اردو کے ساتھ لالہ منشی مول چند مستمند اور اس کے شاہنامہ اردو کا قدرے تفصیلی ذکر ہے۔ مول چند صاحب دیوان شاعر تھے۔

ان کے دو بیٹے بھی شاعر تھے۔ ایک کا نام سمن لال تخلص فدوی تھا اور دوسرے کا لالہ سکھپت رائے تخلص نحیف وہ بریلی میں رہتے تھے دلّی گئے تو ذکا سے ملے تھے۔

ہسٹری آف ہندی لینگویج اینڈ لٹریچر مطبوعہ بھارتی بھون بمبئی سن 1978ء مصنفہ آر۔ اِل۔ ہانڈا کے مطابق اٹھارویں صدی کے اواخر میں دکھن کا ایک اور ہندی ادیب پیم چند (۱۷۹۳) ہوا وہ اپنے زمانے کا مشہور شاعر تھا اس کا شاہ کار کا نامہ ہندی شاہنامہ تھا جو فردوسی کے مشہور شاہنامے کا ترجمہ ہے وہ دیوگڑھ (ناگپور) کے صوبے دار کا درباری شاعر تھا۔" اس نے بھی شمشیر خانی کا ہی منظوم ترجمہ دکنی اردو میں کیا ہے ہندی میں نہیں۔ ۱۲۰۷ ہجری میں اس نے نظم کہی ہے۔

فرانسیسی مورخ زبان گارساں وتاسی لکھتا ہے "منشی نے شمشیر خانی کا اردو نظم میں "خسروان عجم کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔"

حیدرآباد کے کتب خانہ ادبیات اردو میں اردو شاہنامہ کا جو مخطوطہ نمبر ۱۰۰۶ موجود ہے اس کا زمانہ تصنیف مابعد ۱۲۰۰ ہجری اور زمانہ کتابت ۱۲۲۸ ہجری بتایا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ توکل علی بیگ کولابی حسینی کی شمشیر خانی کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔

آغا سہیل جنہوں نے بڑی توجہ اور محنت سے رجب علی بیگ سرور کی کتاب سرور سلطانی مرتب کی ہے لکھتے ہیں۔

"نول کشور پریس (کانپور) نے بھی سرور سلطانی کے منظوم ترجمے کو شائع کیا جو مول چند اور مرزا مہدی علی خاں قبول کی کوشش ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں۔

''قبول کا منظوم ترجمہ میں نے دیکھا ہے، دلچسپ ہے لیکن ادبی خوبیوں سے عاری ہے۔''

ڈاکٹر نیر مسعود جنہوں نے رجب علی بیگ سرور پر کام کیا ہے۔ مول چند کے شاہنامہ اردو کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا آغا سہیل حوالہ دیتے ہیں لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ اس بات سے واقف ہوتے ہوئے بھی کہ منشی مول چند نے شمشیر خانی کا ترجمہ کیا ہے وہ اُسے سرور سلطانی کا ترجمہ قرار دیتے ہیں اس طرح شاہنامہ اردو کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جبکہ شاہنامہ کو اولیت حاصل ہے اور 42 برس پہلے مکمل ہوئی ہے۔

مول چند کے اردو شاہنامے کا ذکر کئی تذکروں میں ہے لیکن مرزا علی مہدی علی خاں قبول کے منظوم ترجمے کا ذکر میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

آغا سہیل کی تحریر سے بھی یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ سرور سلطانی کے جس منظوم ترجمے کا ذکر کر رہے ہیں وہ مول چند اور مہدی علی خاں قبول کی مشترکہ کوشش ہے یا ان دونوں نے الگ الگ کوششیں کی ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے مول چند کا ترجمہ بھی دیکھا تھا یا نہیں۔ غالباً انہوں نے نہیں دیکھا یا جان بوجھ کر تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔

آغا صاحب کے بیان سے کئی غلط فہمیوں کا اندیشہ ہے لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے کہ شاہنامہ اردو کوئی مشترکہ کوشش نہیں بلکہ یہ بلا شرکت غیرے لالہ منشی مول چند مستمند کی تصنیف ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ دو دلچسپ ہے مگر ادبی خوبیوں سے عاری ہے''

دتا سی کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ شمشیر خانی کا ترجمہ منشی نے ''خسروان عجم'' کے نام سے کیا تھا۔ ''خسروان عجم'' سے اس تصنیف کی سال تاریخ نکالی گئی ہے۔ منشی جی کہتے ہیں۔

دتا سی کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ شمشیر خانی کا ترجمہ منشی نے ''خسروان عجم'' کے نام سے کیا تھا۔ ''خسروان عجم'' سے اس تصنیف کی سال تاریخ نکالی گئی ہے۔ منشی جی کہتے ہیں۔

مرتب یہ شہنامہ جب ہو چکا ☆ کیا فکر تب سال تاریخ کا

تو پھر ہاتف غیب نے صبحدم ☆ کہا قصۂ خسروانِ عجم

آغا سہیل کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ نول کشور پریس (کانپور) نے بھی ۱۲۲۰ھ سرور سلطانی کے منظوم ترجمے کو شائع کیا جو مول چند اور مہدی علی خان قبول کی کوشش ہے۔''

مول چند نے نہ تو کبھی سرور سلطانی کا منظوم یا پھر منثور ترجمہ کیا نہ انہوں نے اسے دیکھا۔ سرور سلطانی شاہنامے کی تکمیل کے ۴۲ برس بعد لکھی گئی۔

غلام قادر روہیلا نے بیدار بخت کی جگہ محمد اکبر شاہ کو بادشاہ بنا دیا تھا اس نے شاہ عالم کو اندھا کر کے تخت سے ہٹا دیا تھا لیکن تیرہ ہی دن گزرے تھے کہ مرہٹوں نے غلام قادر کو گرفتار کر کے نابینا شاہ عالم کو پھر تخت پر بٹھا دیا ولی عہد مرزا جواں بخت کے انتقال کے بعد اکبر شاہ بلا اختلاف ولی عہد مقرر ہوئے اور شاہ عالم کی وفات کے بعد ۷رمضان ۱۲۲۱ ہجری مطابق ۹ رنومبر ۱۸۰۶ میں انگریزوں کی سرپرستی میں محمد اکبر شاہ دہلی کے بادشاہ ہوئے اور شاہ ثانی کہلائے مول چند نے محض ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ لکھا ہے اس لئے کہ اس وقت ''ثانی'' کا لقب اختیار نہیں کیا تھا۔ اکبر شاہ ثانی 28 رستمبر 1837ء کو فوت ہوئے۔

شاہنامہ اردو سرور سلطانی سے فنی اعتبار اور ادبی معیار سے بہت بلند ہے۔ سرور سلطانی کی زبان پر تکلف اور مصنوعی ہے قافیہ پیمائی کے شوق نے نفس مطلب کی ترسیل کو بے مزہ اور تکلیف دہ بنا دیا ہے۔ کردار نگاری منظر کشی، واقعہ نگاری کسی بھی معاملے میں رجب علی بیگ کامیاب نہیں ہوئے اصل قصہ کو مجروح کر کے انہوں نے دیگر ماخذوں کے سہارے خواہ مخواہ تفصیلات مہیا کرنے کی کوشش کی ہے جا بجا فردوسی

کے اشعار نقل کر کے سرور سلطانی کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن فردوسی کے اشعار ٹاٹ میں مخمل کے پیوبند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جبکہ مول چند زبان و بیان، کردار نگاری، منظر کشی، واقعہ نگاری، تخیل کی بلند پروازی اور پھر تمام اجزا کی بہترین آمیزش پر قدرت رکھتے ہیں۔ سرور کی یہاں بے جا تکلف اور ناہمواری ہے مگران عیوب کا منشی کے یہاں دور دور تک پتہ نہیں۔

مثال کے طور پر شمشیر خانی، سرور سلطانی اور شاہنامہ اردو کے ابتدائی حصوں کا موازنہ ملاحظہ ہو۔

"آوردہ اند اول کسے کہ آئیں تخت و تاج و کلاہ پادشاہی در جہاں بنیاد نہاد۔ او (کیومرث) بود۔ در کوہ مسکن داشتے و باگروہ خود پرشش از چرم حیوانات ساقتے۔ او را پسرے بود سیامک نام۔ چنانچہ فردوسی گوید۔

پسر بد مر اورا یکے خوبروئے

خردمند، ہمچوں پدر نام جوئے

سیامک، بدش نام و فرخندہ بود

کیومرث رادل بدو زندہ بود

بہ جسانش بزار مہر بریاں بدے

زبیم جدائیش گریاں بدلے

کیومرث دیو دشمن داشت و اور ابچہ ہائے و بود دیو چہ بدو کفت من بہ جنگ کیومرث می روم۔ دیو جمع از دیواں ہمراہ کرد و اور ارخصت داد۔"

شمشیر خانی از توکل علی بیگ حسینی کولابی

اب سرور کی سرور سلطانی سے اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"راویان اخبار و حاکیان آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار، بے ثبات میں روش سلطنت نکالی، تخت و تاج کی بناڈالی، عدل و داد کو رواج دیا، محصول و خراج لیا۔ وہ کیومرث تھا۔ الا بود و باش کوہ و بیان کی اور پوشاک پوست حیوان کی۔ بیٹا اس کا

سیامک نام تھا۔ اس کو عبادت کے سوا اور نہ کچھ کام تھا۔ دیو نے اس کو مارا کیومرث کو بہت قلق ہوا۔ ہوسنگ سیامک کا بیٹا تھا اس نے باپ کے خون کا بدلہ لیا۔ دیو کو قتل کیا۔ تیس برس کیومرث نے سلطنت کی۔"

سرور سلطانی رجب علی بیگ سرور

اور اب مول چند کے شاہنامہ اردو سے شمشیر خانی کے مذکورہ بالا حصے کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

سخن گوئے روشن دل و ہوش مند ☆ یہ کہتا ہے زیرِ سپہر بلند
ہوا پہلے جو کوئی کشور کشا ☆ شہہ درد گستر کیومرث تھا
سدا کوہ میں تھا وہ مسکن گزیں ☆ بجز چرم پوشاک تھی کچھ نہیں
سیامک تھا اس شاہ کا اک پسر ☆ خرد مند مثل پدر نامور
کیومرث کا دشمن اک دیو تھا ☆ ارادہ اسے اس سے تھا جنگ کا
غرض بچہ اس دیو کا ایک بار ☆ پدر سے لگا کہنے اے نامدار
یہ ہے غرض میری کہ جو حکم ہو ☆ تو جاؤں کیومرث کی جنگ کو
سنا اس نے جب یہ بیان پسر ☆ تو دیوؤں کی فوج اسکے ہمراہ کر
کیا اس کو فوراً رواں سوئے شاہ ☆ کہ تا ہو کیومرث سے کینہ خواہ
سیامک نے جس دم سنی یہ خبر ☆ کیا عرض جا کر حضورِ پدر
کہ اب حکم کا ہوں میں امیدوار ☆ جو ہو حکم جاؤں پئے کار زار
کیومرث نے اس کو رخصت کیا ☆ بہت اس کے ہمراہ لشکر کیا
جو وہ بادشہ زادۂ جنگ جو ☆ ہوا بچۂ دیو کے رو برو
تو پھر ہاتھ سے بچۂ دیو کے ☆ نہ ہرگز ہوئی پھر رہائی اسے
سیامک ہوا رزم گہ میں ہلاک ☆ ملا جسم اس کا تہہ خون و خاک
یکایک جو لشکر نے کھائی شکست ☆ سپہر بریں نے کیا سب کو پست
حضور کیومرث آئے دواں ☆ ہوا شاہ غمگین و گریہ کناں

توکل بیگ کی فارسی نثر سادہ، سہل، رواں اور عام فہم ہے الفاظ موزوں اور برمحل ہیں عبارت میں نہ طوالت ہے نہ بیجا اختصار مفہوم قاری تک پہنچ جاتا ہے قاری نہ تو الجھن کا شکار ہوتا ہے اور نہ گمراہ۔

لیکن سرور کی نثر بے کیف، اکتانے والی، گمراہ کن اور غیر ضروری الفاظ سے گراں بار ہے طوالت، تکلیف سے مطلب کی ترسیل میں رکاوٹ آتی ہے کہیں کہیں ایک آدھ جملوں میں تشبیہہ واستعارے کا حُسن تھوڑی دیر کے لئے اپنی چمک دکھاتا ہے اور بس۔

توکل کہتے ہیں ''سب سے پہلے جس نے اس دنیا میں آئیں وتاج کلاہ بادشاہی کی بنیاد رکھی وہ کیومرث تھا۔ وہ پہاڑ پر رہتا تھا اور اپنے لوگوں کے لئے حیوانات کے چمڑے کا پوشاک بنایا۔ اس کا ایک لڑکا تھا جس کا نام سیامک تھا چنانچہ فردوسی کہتا ہے۔''

بیان صاف ہے نہ ضرورت سے زیادہ الفاظ ہیں نہ ضرورت سے کم۔ جملے مربوط ہیں ترسیل خیال میں کہیں کوئی رکاوٹ نہیں۔

لیکن سرو فرماتے ہیں۔

''پہلے جس نے گلزار بے ثبات میں روش سلطنت نکالی، تخت وتاج کی بنیاد ڈالی۔ عدل وداد کو رواج دیا، محصول وخراج لیا وہ کیومرث تھا۔''

یہاں عدل و داد و محصول وخراج بالکل غیر ضروری ہیں اسی طرح ''اس کو عبادت کے سوا اور کچھ کام نہ تھا'' بالکل غیر ضروری اور گمراہ کن ہے۔ جنگ جوئی کو عبادت کے سوا بھی ہزاروں کام ہوتے ہیں۔

سرور نے فردوسی کے اشعار نقل کر کے اپنی تصنیف میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے توکل نے بھی ایسا کیا ہے لیکن مول چند نے فردوسی کے اشعار نہیں دئے۔

مول چند فردوسی جیسا بلند پایہ شاعر نہیں لیکن بلاشبہ مول چند کے اشعار میں بہت جان ہے اور پرانے طرز کا استعمال کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہندوستان

کے فردوسی ہیں۔ شاہنامہ اردو اور شاہنامہ فردوسی کا ایک سرسری موازنہ بھی اس حقیقت کی شہادت کے لئے کافی ہے۔

مثال کے طور پر سیامک کی موت کا حال دیکھئے سیامک کی موت دردناک ہے جس سے کیومرث جیسے بہادر بادشاہ کا دل پاش پاش ہوجاتا ہے کیومرث سیامک سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ اس کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا اس بات کو فردوسی نے مندرجہ ذیل اشعار میں قلم بند کیا ہے۔

پسر بد مُرا اورا یکے خوبروئے ☆ خرومند ہمچوں پدر نام جوئے
سیامک بدش نام وفرخندہ بود ☆ کیومرث رادل بدو زندہ بود
بہ جانش بزار مہر بریاں بدے ☆ زبیم جدائیش گریاں بدے

سیامک کی موت اوراس کی المناک خبرسُن کر کیومرث کا جو حال ہے اسے سرور نے ایک سپاٹ جملے میں اس طرح کہا ہے۔ ''دیو نے اس کو مارا کیومرث کو بہت قلق ہوا۔''

مول چند کہتے ہیں۔

سیامک ہوا رزم گہ میں ہلاک ☆ ملا جسم اس کا تہہ خون وخاک
یکا یک جو لشکر نے کھائی شکست ☆ سپہر بریں نے کیا اس کو پست
حضور کیو مرث آئے دواں ☆ ہوا شاہ غمگین وگر یہ کناں
سیامک کا یکساں ماتم رہا ☆ دل وجان کو اپنے پُر غم رکھا

مول چند الفاظ سے منظر کھینچتے ہیں ''ملا جسم اس کا تہہ خون وخاک'' اس کی ہلاکت سے لشکر کے حوصلے پست ہوگئے اور سپاہی دوڑتے ہوئے کیومرث کے حضور میں آئے۔

اس بیان سے آنکھوں کے سامنے پورا منظر پھر جاتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے سیامک کا جسم خاک وخون میں لپٹا ہے لشکر میں ہلچل ہے اس کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اور وہ دوڑتے ہوئے کیومرث کے حضور میں آتے ہیں۔ یہاں ''دواں'' کا لفظ

دوڑنے کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔

مول چند نے دراصل شمشیر خانی کو ہی پیش نظر نہیں رکھا بلکہ اس نے فردوسی کے شاہنامہ کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اس کا بہت ہی لاجواب ترجمہ کیا ہے۔ مول چند کو احساس ہے کہ اس کا مقابلہ فردوسی جیسے شاعر سے ہے اس لئے توجہ سے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فردوسی کے اشعار اور مول چند نے جو اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اس کا موازنہ ملاحظہ ہو۔

بدیں پرنیاں زاں دلم شد دژم ☆ کہ دیدم درد پیکر شاہ جم

بیاد آمدم فرو ہرہنگ او ☆ بزرگی و دیہم و اورنگ او

زخوے بد چرخم اندر شگفت ☆ کہ بر کتف مارست در چہرہ دیو

اب مول چند کا کلام دیکھئے۔

سوِے پرنیاں کی جو میں نے نگاہ ☆ تو دیکھی شبیہہ جم اے رشکِ ماہ

مجھے یاد آیا وہ جاہ و حشم ☆ بزرگی و اورنگ و تاج و علم

کیا جور چرخ ستم گرنے ہائے ☆ کیا ظلم اس ظلم پر ورنے ہائے

کیا شاہ جمشید کو یوں تباہ ☆ لیا چھین یکدست تاج و کلاہ

جہاں کا کیا شاہ ضحاک کو ☆ دیا تاج و تخت ایک ناپاک کو

دو مارِ سیہ جس کی ہیں کتف پر ☆ وہ صورت میں ہیں دیو سے بھی بتر

ایک اور جگہ رستم اور سفید ہاتھی کا احوال ہے رستم سفید ہاتھی پر وار کرتا ہے اور ہاتھی زمین بوس ہو جاتا ہے اسے فردوسی نے اس طرح لکھا ہے۔

تہمتن یکے نعرہ زد ہمچو شیر ☆ سیدو آمد بر اور دلیر

یکے گرز پولاد زد بر سرش ☆ کہ خم گشت بالائی کہہ پیکرش

مول چند اس بات کو اس طرح سے نظم کرتے ہیں۔

ہوا جاکے نعرہ زناں مثل گیر

جو مارا بزور ایک گرزِ گراں

گرا خاک پر بس وپیل دماں

اس طرح رستم جب اپنا گھوڑا اتلاش کرتا ہوا شاہ سمنگان کے یہاں پہنچتا ہے اور شاہ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے بعد رات کو بستر پر دراز ہوتا ہے تو اچانک ''دختر والئی سمنگاں'' برآمد ہوتی ہے۔ اس منظر کو سرور نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''ایک ساعت کے بعد حوروش نازنین از پس پردہ نکل کے رستم آگے آ بیٹھی''
ایک جاندار منظر کو سرور نے بے جان کر دیا ہے۔ حالانکہ سرور کو فردوسی اور مول چند دونوں سے زیادہ آزادی تھی۔ اب دیکھئے فردوسی اسے کیسے پیش کرتا ہے۔

زپردہ بسر آمد یک ماہروئے ☆ چو خورشید تاباں پر از رنگ وبوے
دو ابرو کمان و دو گیسو کمند ☆ ببالا بکردار سروِ بلند
بہ پرسید رستم کہ نام تو چیست ☆ چہ جوئی شب تیرہ کامِ تو چسیت
چنیں داد پاسخ کہ تہمینہ ام ☆ تو گوئی کہ از غم بدو نیمہ ام
یکے وقت شاہ سمنگاں منم ☆ برشک ہز بر پلنگان منم

اوراب دیکھئے اس بات کو مول چند نے کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ اگر فردوسی اردو میں کہتا تو اس سے بہتر کیا کہتا۔

پس پردہ واں رات کو ناگہاں ☆ نمایاں ہوئی اک بت دلستان
سمنبر گل اندام شمشا دقد ☆ پری چہرہ مہ روئے و خورشید خد
جو دیکھی وہ دلدار آئینہ رد ☆ تو حیران رہا رستم نام جو
یہ پوچھا کہ تو کون ہے کیا ہے نام ☆ لگی کہنے تب یوں بت لالہ فام
کہ شام سمنگاں کی دختر ہوں میں ☆ پری چہرہ و ماہ پیکر ہوں میں
مرا نام تہمینہ ہے اے جواں ☆ رہوں جوں پری مرد ماں سے نہاں

رجب علی بیگ کہتے ہیں۔

''تیرا اوصاف سن کر مدت سے مشاق تھی، جدائی بہت شاق تھی نادیدہ درم

محبت میں گرفتار تھی۔ زیست سے بیزار تھی خدا سے عہد تھا کہ جو ہر کروگی مگر تیرے سوا اور نہ شوہر کروگی۔''

مول چند اسی بات کو اس طرح کہتے ہیں۔

ولے تیرے محبت سے دیوانہ ہوں ☆ قرار و صبوری سے بیگانہ ہوں
ہوئی والہ سن کر تیری خوبیاں ☆ خدا سے کیا عہد میں نے کہ ہاں
کسی کی نہ ہوں جفت تیرے سوا ☆ تمنائے دل تھی یہ صبح و مسا

سرور نے جوہر کا ذکر خواہ مخواہ کیا ہے جوہر خالص ہندوانی رسم تھی شاہ سمنگاں کی بیٹی کا جوہر کرنا بیکار سی بات ہے۔

منشی مول چند مستمند سب تالیف کتاب کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

عزیزان معنی شناس ایک روز ☆ کہ تھا مثل نور و زبہجت فروز
بہم محفل آرا تھا ہنگام شب ☆ مہیا تھے ساماں عیش و طرب
وہ مجلس تھی رشک بہار چمن ☆ ہر ایک لحظ تھا ذکر شعر و سخن
تواریخ کو جو کہ مذکور تھا ☆ تو پھر ہر کسی نے بیاں یوں کیا
کہ ہے شاہنامہ تماشا کتاب ☆ عجب نظم دلکش ہے با آب و تاب
ولے ہر کسی کو میسر نہیں ☆ یہ تاریخ فرخ نہیں ہر کہیں
توکل کہ مرد سخن سنج تھا ☆ کیا ترجمہ اس نے شہنامہ کا
لکھا نثر میں نسخۂ مختصر ☆ کہ احوال معلوم ہو سر بسر
بہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے ☆ تمام اس میں احوال مرقوم ہے
یہ سُن کر برادر مرے مہربان ☆ سخن فہم و دانشور و نکتہ داں
کہ زور آوران کا جہاں میں ہے نام ☆ بخلق پسندیدہ مشہور نام
یہ بولے کہ اے منشی اس نامے کو ☆ تم اب ریختے کی زبان میں لکھو

مسلسل مربوط مناسب اور موزوں اظہار ہے۔ اشعار ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اشعار غزل کے نہیں بلکہ نظم کے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہئے۔

جبکہ سرور نثر میں لکھ رہے ہیں پھر بھی اٹمل بے جوڑ ٹکرے ہیں۔ جملے ایک دوسرے سے مصنوعی طور پر مربوط ہیں معنوی ربط وارتقا مفقود ہے۔

شاہنامہ اردو 1220 ہجری مطابق 1865 عیسوی میں ختم ہوا۔ ''قصہ خسروان عجم'' سال تاریخ ہے۔

ضرورت یہ ہے کہ شاہنامہ اردو پر توجہ کی جائے۔ اس کی تاریخی ادبی، فنی، لسانی اہمیت اور حسن پر روشنی ڈالی جائے۔

☆☆☆

اقبالؔ کی اوّلیں تصنیف

اقبال کی عظمت کا سبب بلاشبہ ان کی شعری تخلیقات اور فلسفیانہ افکار ہیں لیکن خود اقبال ایک زمانے میں اپنی شاعری کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے یورپ کے دوران قیام شاعری ترک کر دینے کا بھی ارادہ کیا تھا لیکن اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ اور سر عبدالقادر کے اصرار پر اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا اور شاعری کا سلسلہ جاری رکھا لیکن یورپ جانے سے پہلے کی شاعری اور یورپ جانے کے بعد کی شاعری میں نمایاں فرق ہے 1905ء میں وہ یورپ گئے وہاں قانون پولٹیکل، سائنس اور معاشیات کا مطالعہ کیا۔ ''ایران میں فلسفہ الہیات کا ارتقا'' پر پی۔ ایچ کی ڈگری لی لیکن یورپ سے اصل چیز جو انہوں نے حاصل کی وہ ہے ''پان اسلام ازم'' سے وابستگی۔

یورپ سے واپسی کے بعد فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وکالت بھی کی شاعری کا سلسلہ بھی چلتا رہا اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے اس سے پہلے یعنی یورپ کو روانگی سے پہلے ان کی فکر و نظر کا محور صرف ''مسلمان اور اسلام'' نہ تھا بلکہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' تھا اور اس کی ''بلبلیں'' تھیں۔ انہوں نے ایم۔ اے تو فلسفہ میں کیا تھا لیکن ریڈر عربک کے مقرر ہوئے تھے اس کے بعد فلسفہ کے اور انگریزی کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ لیکن ان کی اولیں تصنیف

معاشیات پر تھی۔ ہر چند کہ ایسا انھوں نے ضرورتاً کیا تھا مگر اس موضوع سے انھیں دلچسپی تھی۔ اور شاید اسی لیے انکی اولیں تصنیف نہ فلسفیانہ ہے اور نہ شاعرانہ بلکہ خالص غیر شاعرانہ یعنی معاشیات سے متعلق ہے اس کا نام ہے علم الاقتصاد۔ لیکن اس کتاب کو اکثر ماہرین اقبالیات نے درخور اعتنا نہیں سمجھا حالانکہ اس کتاب سے اقبال کی شخصیت کے کئی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ اقبال کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں کئی اعتبار سے معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کئی اہم موضوعات پر اپنی ''رایوں'' کا اظہار کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی یہ ''آرا'' فلسفہ یا نظریہ کا درجہ نہیں رکھتیں لیکن ان سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے فلسفہ اور نظریہ کے پیچھے کون سے۔ ''آرا'' کارفرما ہیں اور ان کی شخصیت اور شاعری کے ارتقا میں معاشیات کے مطالعہ کا کتنا اہم عمل دخل رہا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ یورپ جانے سے پہلے اقبال ایک اچھے شاعر اور عام ہندوستانی مسلمان کے مقام سے بلند نہیں ہوئے تھے۔ اسلام کا انہوں نے مطالعہ ضرور کیا تھا لیکن ایک نظام حیات کی حیثیت سے اس کی جو اہمیت ہے۔ اس سے واقف نہ تھے خود ان کے لفظوں میں ''اس وقت تک ''محرم راز درون میخانہ'' نہ تھے مختلف مسئلوں پر اسلامی نقطہ نظر سے بھی انہیں یا تو واقفیت نہ تھی یا دلچسپی نہ تھی مثال کے طور پر ''سود'' فیملی پلاننگ ''سرمایہ کاری'' افلاس'' وغیرہ سوالوں پر انہوں نے ایک عام ذہین طالب علم کی حیثیت سے ہی غور کیا تھا۔ مفکر اسلام کی نظر سے نہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے 1902ء تک مارکس کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی سوشلزم اور سرمایہ داری کے فرق سے پوری طرح آگاہ تھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خواص کی بہ نسبت عوام سے زیادہ دلچسپی تھی اور یہ ہمیشہ بر قرار رہی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 28رمئی 1937ء کو اپنے ایک خط میں جناح کو مشورہ دیا تھا ''لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ آیا وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ بن کر رہے گی یا ایسے عام مسلمانوں کی جماعت

بے گی جنہوں نے ابھی تک معقول وجہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ شخصی طور پر میں یقین کرتا ہوں کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کے لیے کوشاں نہ ہو عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔'' علم الاقتصاد کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو افلاس سے گہری نفرت تھی اور اسے انسان کے دکھ درد کا سرچشمہ سمجھتے تھے افلاس سے یہ نفرت انہیں سوشلزم اور مارکس کے معاشی فلسفے کے نزدیک لے گئی تھی روس سے ان کی دلچسپی اور روسی انقلاب کی توصیف کے پیچھے بھی یہی جذبہ تھا اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ سوشلسٹ نظام سیاست میں ''باخدا'' اور ''صاحبانِ دین'' کو بھی اپنے طور پر پھلنے پھولنے کی آزادی حاصل ہے تو شاید وہ ہندوستان میں بھی سوشلسٹ نظام سیاست کی وکالت کرتے اور دو قومی نظریہ کے پنپنے کی اتنی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

چونکہ یہ کتاب 1902ء کے لگ بھگ لکھی گئی تھی اور اب اتنے برسوں میں تقریباً نایاب ہو چکی ہے اس لیے میں اس کتاب کے مختصر تعارف کے ساتھ ساتھ چند ایسے اقتباسات بھی پیش کر رہا ہوں جن سے اقبال کی بعض ''آرا'' سے آگاہی ہوتی ہے اس کے علاوہ اقبال کے ایک مداح اور ''ہندوستان میں جدید اسلام'' کے مولف ڈبلو۔ سی۔ اسمتھ کے اس قول کی حیثیت بھی اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ ''اقبال اقتصادیات اور عمرانیات سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔

علم الاقتصاد تقریباً 1902/3ء میں لکھی گئی ہے۔ ڈیمائی سائز کے ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے کتاب میں شاید ہی اسلام یا مسلمان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے البتہ انسان، غریب، لوگ اور اہل ہندوستان کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ اس وقت تک وہ اہل ہندوستان کو ایک ہی قوم سمجھتے تھے اور تمام بیماریوں کے علاج کے لیے ''موجودہ اقتصادی حالات'' کا سنوارنا ضروری خیال کرتے تھے۔

لکھتے ہیں ''اس (علم الاقتصاد) کا مطالعہ تقریباً تقریباً ضروریات زندگی میں سے ہے بالخصوص اہل ہندوستان کے لیے تو اس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور

کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز ان تمدنی اسباب سے کامل ناواقف ہے جن کا جاننا قومی فلاح اور بہبودی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنی تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں ان کا حشر کیا ہوا؟ موجودہ اقتصادی حالات کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی ہے۔ پس اگر اہل ہندوستان دفترِ اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی ہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں۔''

علم الاقتصاد کے بارے میں ان کا خیال تھا یہ انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کی تحقیق ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں پس ایک اعتبار سے اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔ غریبی کے بارے میں ان کے خیالات کافی دل چسپ ہیں لکھتے ہیں'' ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے اِنسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی اقوائے انسان پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات انسانی روح کے مجلّہ آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود وعدم برابر ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک درد مند دل کو دکھ دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟''

اقبال نے اس کتاب میں محض مشہور اور مستند کتب سے مضامین ہی اخذ نہیں

کیے بلکہ خود اپنی ذاتی رائے بھی پیش کی ہے۔ مگر صرف اسی صورت میں جہاں انہیں اپنی ذاتی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔ لکھتے ہیں ''میری غرض ان اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کردوں اور نیز بعض جگہ پر اس بات پر بھی بحث کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں اگر ان سطور سے کسی فرد واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہوگئی تو میں سمجھوں گا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی۔''
زبان اور طرز عبارت کے بارے میں لکھا ہے۔ ''اس قدر عرض کردینا کافی ہوگا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متعین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔
اصطلاحات کے وضع کرنے کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر بامذاق آدمی جانتا ہے میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانہ حال کی عربی زبان میں آج متداول ہیں جہاں جہاں کسی اُردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی ساتھ اس کی تصریح بھی کردی ہے اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورہ کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً ''سرمایہ'' سرمایہ داروں کے معنوں میں۔ اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہوگا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جس کو بامذاق لوگ خوب محسوس کرسکتے ہیں جہاں کئی فارسی میں محاورات کے لفظی تراجم اردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورہ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل بھی کرلیا جائے تو کیا ہرج ہے۔

اصطلاحات کی نسبت ایک اور عرض یہ ہے کہ میں نے مانگ اور طلب و دستکاری اور محنت دستکار اور محنتی نفع اور منافع۔ ساہوکار اور سرمایہ دار مالک وسرمایہ دار

مرادف استعمال کیے ہیں۔ پیدائش اور پیداوار کا استعمال ایک خفیف فرق کو ظاہر کرتا ہے یعنی پیدائش سے مراد فصل ہے اور پیداوار سے مراد نتیجہ فصل کی علی ہذ القیاس لفظ تبادلہ اس جگہ استعمال کیا ہے جہاں تبادلہ اشیاء زرِ نقد کے وساطت سے کیا جائے اور لفظ مبادلہ اس موقع پر استعمال کیا ہے جہاں ایک شے دوسری شے کے عوض میں دی جائے۔ عربی زبان میں تبادلے کا یہ مفہوم لفظ مقائفہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر چونکہ یہ لفظ عام نہیں ہے اس واسطے میں نے اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔

ضبط تولید کا سوال آج ایک سلگتا ہوا سوال ہے اس کے متعلق اقبال کا خیال ہے ”جس ملک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو وہاں کے لوگوں کو چاہئے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو اختیار کریں جو آبادی کے ترقی کو روکتے ہیں انسان کے قوت توالد و تناسل قدرتاً اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے عمل کو اختیاری یا غیر اختیاری اسباب سے روکا نہ جائے تو اس کا وجود مجموعی طور پر بنی آدم کی بربادی اور تباہی کا باعث ہوگا غریبی اور افلاس کی صورت میں انسان کی قوتِ تناسل اور توالد مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے۔ جس سے آبادی زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے اور مفلس کے درد کی شدّت کو اور جان فرسا بنا دیتی ہے— تم جانتے ہو مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے گی اور چوری، قتل، قمار بازی اور دیگر جرائم جو اس دہشت ناک آزار سے پیدا ہوتے ہیں یک قلم معدوم ہو جائیں گے۔ مگر موجودہ حال کے زور سے اس کالی بلا کے پنجے سے رہائی پانے کی یہی صورت ہے کہ نوع انسانی کی آبادی کم ہو لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم کمی آبادی کے ان اسباب کو عمل میں لا دیں جو ہمارے اختیار میں ہیں کہ ان اسباب کا عمل قدرتی اسباب کے عمل سے متحد ہو کر انسانی آبادی کو کم کرے اور دنیا مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو کر عیش و آرام کا ایک دل فریب نظارہ پیش کرے۔“

اقبال نے محض مشہور اور مستند کتب سے مضامین ہی اخذ نہیں کیے ہیں بلکہ ذاتی رائے بھی پیش کی ہے لکھتے ہیں ”ہماری ذاتی رائے حکیم موصوف کے خلاف ہے وہ

اجنبیت اور غیریت جو حیوانوں کو قانون افراد تو یہ کہ تحت میں لاتی ہے مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں کے درمیان ضرور موجود ہے۔ اگرچہ کہ ایک خاندان کے افراد کے درمیان نہیں۔ حکیم موصوف کا خیال اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب تمام انسان یہ محسوس کریں کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور نہ صرف محسوس ہیں کریں بلکہ عملی طور پر اس کو کر کے بھی دکھا دیں۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمدنی انسان کے سب سے اعلیٰ صورت یہی ہے کہ تمام بنی نوع انسان حقیقی بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں مگر چونکہ نفس الامر میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے وہ اجنبیت اور غیریت جو حیوانوں میں موجود ہے وہ انسانی خاندانوں اور قوموں میں بھی موجود ہے فرق صرف یہ ہے کہ حیوانات میں مصاف زندگی افراد کے درمیان جاری ہے مگر انسانوں میں یہ لڑائی خاندانوں اور قوموں کے درمیان جاری ہے پھر خاندان اور قوم اس مصاف ہستی میں فتح مند ہونے کی خواہش کرتی ہے اور سب کا یہ قدرتی اور فطری تقاضا ہے کہ حریف کو گرا کر تمام روئے زمین کے خود وارث بن جائیں جس طرح اس قانون کے اثر سے حیوانوں کی بعض قسمیں صفحہ ہستی سے معدوم ہو گئیں ہیں اس طرح اسی قانون کے عمل سے انسانوں کی قدیم قومیں بھی حرف غلط کی طرح کتاب ہستی سے مٹ گئی ہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ غیر مادی اشیا مثلاً خیالات و مذاہب بھی اس قانون کے تابع ہیں۔ جو خیال یا مذہب انسان کے تمدنی حالات اور اس کی عقلی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی نہ کر سکے گا۔ ضرور ہے کہ وہ انسان کی جدید روحانی ضروریات کو پورا نہ کر سکنے کے باعث معدوم ہو جائے گا۔"

کتاب کے لکھنے کی تحریک ان کے اُستاد آرنلڈ صاحب نے دی تھی اور مولانا شبلی نعمانی نے کتاب کے بعض حصوں کو پڑھ کر زبان کے متعلق قابلِ قدر اصلاح دی تھی۔ کتاب کی زبان رواں اور سلیس ہے۔ عبارت آرائی سے احتراز کیا گیا ہے البتہ تانیث و تذکیر کا زیادہ لحاظ نہیں کیا گیا۔

کتاب سے بعض طویل اقتباسات میں نے دئے ہیں وہ قابل غور ہیں۔

بابوراج کی حقیقت اور اس کے اثرات

تمہید: دوسری جنگ عظیم کے بعد انگلینڈ کے شہریوں نے اپنے جنگی ہیرو چرچل کی پارٹی کو الوداع کیا اور ترقی پسند رجحانات کی حامل پارٹی کے رہنما اٹلی کو انگلینڈ کی وزارت عظمی سونپ دیا۔

اٹلی نے اپنے چناؤ منشور میں عوام سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ان کی سیاسی جماعت برسر اقتدار آئی تو نوآبادیت کا سیاسی اقتدار مقامی لوگوں کو پوری طرح سونپ دیا جائے گا۔ ان میں ہندوستان نمایاں طور پر شامل تھا۔

اس سے تقریباً نصف صدی پہلے انگلینڈ کے باشعور عوام نے ''ہمارا اٹوٹ حصہ'' کا نعرہ لگانے کی بجائے مقبوضہ ممالک کو آزاد کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ اور کنزرویٹو (دقیانوسی) سیاسی رہنما اور جنگی ہیرو چرچل کی دلیل کو مسترد کر دیا گیا کہ اگر نوآبادیت کو اقتدار سونپ دیا گیا تو وہاں لوگ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے ایک دوسرے کو نوچ کھائیں گے۔

لیبر پارٹی نے برسر اقتدار آتے ہی فیصلہ کیا کہ جون ۱۹۴۷ سے پہلے ہندوستانیوں کو ان کے ملک کا اقتدار سونپ دیا جائے۔ ہندوستان کے نیک نفس گورنر جنرل ویول نے اس قدر عجلت میں اتنا اہم قدم اُٹھانے کو ناپسند کیا اس لئے کہ ان کے خیال میں اس طرح ہندوستانیوں کے ساتھ زیادتی ہونے کے اندیشے زیادہ ہو گئے تھے۔

دراصل عجلت کا فیصلہ اس اعتبار سے غلط تھا کہ اقتدار کی منتقلی کے لئے درکار وقت نہیں دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا انہیں ہندوستانیوں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ کسی بھی طرح اپنا پیچھا چھڑا لینا چاہتے تھے۔ لیکن اس اعتبار سے یہ قدم درست تھا کہ ہندوستانی رہنما جلد سے جلد اقتدار چاہتے تھے اور اس کے لئے تشدد اور جوابی تشدد کا سلسلہ جاری تھا۔

ملک کا ایک بڑا فرقہ (مسلمان) دوسرے فرقوں سے الگ اقتدار کا خواہاں تھا۔ حالانکہ اس فرقے کا قابل لحاظ حصہ مشترکہ اقتدار کے حق میں تھا۔ (دلت بھی الگ اقتدار چاہتے تھے۔ مگر ان کے سامنے ریزرویشن کی تجویز رکھی گئی۔ اور بھی کئی سہولتیوں کا وعدہ کیا گیا۔ حالانکہ اگر انھیں بھی الگ اقتدار دے دیا جاتا تو سب کے حق میں بہتر تھا۔ دراصل ہمارا جذبہ ہوس ہمیں زمین یا ملک کے ٹکڑوں سے روکتا ہے ورنہ اگر ذرا غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔)

۱۴/اگست کو پاکستان اور ۱۵/اگست کو ہندوستان کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا۔

ہندوستانی عوام کے چنے ہوئے نمائندوں نے لگ بھگ ڈھائی برسوں کے غور و فکر کے بعد جنوری ۱۹۴۹ کو دستور ساز قومی اسمبلی میں ہندوستان کے آئین کو اختیار کیا قانون کی حیثیت دی اور نافذ کیا۔

اس آئین کا ڈھانچہ تقریباً وہی تھا جو 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا بنیادی ڈھانچہ تھا۔

ہندوستانی آئین کی چند دفعات جن کی صراحت آئین میں کی گئی تھی فوراً نافذ ہو گئیں مگر تو بعض دفعات 26/جنوری 1950ء سے نافذ ہوئیں۔

اس آئین کے مطابق ہندوستان کے لوگوں کا طرز حکومت آئینی پارلیامانی جمہوری ہے جسے بعد میں سیکولر اور سوشلسٹ بھی قرار دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں پر کسی فرد یا کسی پارٹی کی مرضی کے مطابق حکومت نہیں ہوگی بلکہ ہندوستانی عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کا اجتماع یعنی پارلیامنٹ میں اکثریت

رکھنے والی جماعت یا جماعتوں کے اتحاد کے سربراہ کو صدر جمہوریہ کے پارلیامانی وزیر اعظم (وزیر کے معنی مشیر ہیں اور منتری کے معنی بھی مشیر ہی ہیں) کی حیثیت سے منتخب کیا جائے گا۔ اور وزیر اعظم اپنے ساتھی وزیروں کا انتخاب کریں گے یہ جماعت کابینہ کہی جاتی ہے۔ اور یہی کابینہ آئین کے مطابق حکومت کریگی اور آئین کا بولتا ہوا رصدر جمہوریہ ہوگا جو اپنی رہنمائی کے لئے سپریم کورٹ کے ججوں اور دوسرے مشیروں سے روشنی حاصل کرے گا۔

اس طرح دراصل اس ملک کا حاکم کوئی حقیقی فرد یا جماعت نہیں بلکہ ایک "فرضی شخص" ہے جس کی نمائندگی صدر جمہوریہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کی نمائندگی لامحدود نہیں ہے بلکہ آئین کے حدود کے پابند ہے۔ اور جب تک عوام کے منتخب نمائندے آئین کے مطابق حکومت کرتے ہیں اور پارلیامنٹ صدر کو مشورہ دینے کی اہلیت رکھتی ہے صدر خاندان کے بزرگ ترین شخص کی حیثیت سے جو خاندانی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا برقرار رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ہنگامی صورت حال پیدا ہوتا ہے تو صدر کو آئین کے تحت حاصل اختیار خصوصی پر عامل ہونے کی ضرورت پڑتی ہے۔

اظہار مدعا: حسب بالا تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف گریز کیا جاتا ہے۔

بابوراج: تقریباً سو سال پہلے فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاولی بان نے البیرونی کی طرح ہندوستان بھر کی سیاحت کرکے یہاں کے جغرافیہ باشندوں اور ان کے تمدن کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لے کر انہیں اپنی کتاب میں بڑے سلیقے سے قلم بند کر دیا ہے۔ اس کتاب کا معروف ہندوستانی عالم سید علی بلگرامی نے تمدن ہند کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا جسے ان کے بیٹے نے شائع کیا۔ ڈاکٹر گستاولی بان اس کتاب کی تصنیف سے پہلے عربوں کے تمدن کے مختلف پہلوؤں کا معروفی، اور تجزیاتی مطالعہ پیش کر چکے تھے وہ تمدن ہند میں لکھتا ہے "انگریزی تعلیم کے زیر اثر ایک انوکھا جدید فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو بابو انگریزی داں کے نام سے مشہور ہے یہ ایک

مصنوعی قوم کا فرد ہے۔ انگریزی تعلیم کے زیر اثر وہ سارا اخلاقی اعتبار اور یقین کھو چکا ہے۔ وہ اپنے باپ داداؤں کے اعتقادات گنوا چکا ہے۔ اور اس نے یورپی لوگوں کے اصول، چال چلن بھی پورے طور پر اختیار نہیں کیئے ہیں۔ اس کی راستی اور دیانت داری صرف وہیں تک محدود ہے جہاں تک کہ اس کو پولس کی حراست کا خوف ہے۔

''وہ مزید لکھتا ہے۔''بابو جس قدر انگریزوں کے سامنے غلام کی طرح دب جاتا ہے اسی قدر اس کا برتاؤ اپنے دیسی بھائیو سے جن کا کام اس سے پڑتا ہے سخت تحکمانہ اور حقارت کا ہوتا ہے۔''

وہ مزید لکھتا ہے۔''اگر کسی بابو کا کس پرانے دیسی طرز کے تعلیم یافتہ سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دیسی تعلیم یافتہ بابو کے مقابلے میں کیسا سنجیدہ، لائق خوش آداب اور خوش اخلاق ہوتا ہے۔ اگر اسے کسی یورپی جلسے میں کھڑا کر دیا جائے تو خود بخود اس کی عزت اور وقار کا دل میں خیال پیدا ہوتا ہے۔''

چونکہ یہ بابو ہی دراصل کابینہ یا صدر جمہوریہ اور یہاں تک کہ ہندوستان کے مصنف اعلی (چیف جسٹس) کے ہاتھ پاؤں اور دیگر حواس خمسہ کا کام کرتے ہیں اس لئے عام طور پر کابینہ ان کے مفاد کی حفاظت کرتی ہے۔ اور یہاں تک کہ یہی لوگ ملک کے اصلی حاکم کا کردار ادا کرتے ہیں اور جب اور جہاں تک چاہتے ہیں آئین یعنی قانون کی مٹی پلید کرتے ہیں چونکہ یہ لوگ براہ راست پارلیمنٹ یعنی عوام کے نمائندوں کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں اس لئے وہ ہر طرح سے محفوظ ہیں اور انہیں لوگوں کے لئے ہندوستانی آئین میں خاص طور پر دو دفیات (آرٹیکل) رکھے گئے ہیں آرٹیکل 300 ان بابوؤں کو آئین سے بالاتر حیثیت عطا کرتا ہے۔ اور وہ ہندوستان کے دوسری شہریوں کی طرح قانون کی نظر میں عملی طور پر برابر نہیں بلکہ بالا تر قرار پاتے ہیں۔

آئین کی دفعہ 300 میں درج ہے۔

(۱) بھارت کی یونین کے نام سے بھارت کی حکومت مقدمہ دائر کر سکے گی اور

اس پر مقدمہ دائر کیا جا سکے گا۔ اور ریاست کے نام سے ریاست کی حکومت مقدمہ دائر کر سکے گی اور اس پہ مقدمہ دائر کیا جا سکے گا۔ اور ان توضیعات کے تابع جو اس آئین سے عطا کئے ہوئے اختیارات کی رو سے پارلیمنٹ یا ایسی ریاست کی مجلس قانون ساز کے وضع کئے ہوئے ایکٹ کے ذریعہ بنائے جائیں یا اپنے متعلقہ امور کے تعلق سے اس قسم کی صورتوں میں مقدمہ دائر کر سکیں گے یا ان پر مقدمہ دائر کیا جا سکے گا جیسا کہ بھارت کی Domian ڈومی ین (مقبوضہ علاقہ) اور مماثل صوبے یا مماثل بھارتی ریاستیں دائر کر سکتی تھیں یا ان پر دائر کیا جا سکتا تھا گر یہ آئین نہ وضع کیا گیا ہوتا۔

مذکورہ ''بیان کج'' کا آخری جملہ دراصل اہم ہے اور ہمارے ملک اور عوام کے لئے شرمناک بھی ہے۔ بظاہر تو یہ دفعہ بڑی معصوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سرکار پر مقدمہ کیا جا سکتا ہے اور سرکار بھی مقدمہ کر سکتی ہے مگر یہ مقدمے (چاہے سرکار کی طرف سے ہوں یا سرکار پر ہوں) بالکل اسی طرح سے ہونگے جیسے اس زمانے میں ہوتے تھے جب ہندوستانی انگریزوں کا مقبوضہ علاقہ تھا اور ان معاملات میں یہ سمجھا جائے گا کہ صورت حال وہی ہے جو اس آئین کے نفاد سے پہلے تھی۔ گویا ''سرکار اور عوام'' کا رشتہ مقدمات کی خد تک آقا اور غلام کا ہوگا۔ اور آئین نے جو حقوق (اور بعد میں فرائض) ہندوستانی عوام کو تفویض کیے ہیں مثلاً قانون کی نظر میں ہندوستان کے تمام لوگ برابر ہیں (دفعہ 13) اور دیگر دفعات 14 اور 19 وغیرہ بے معنی بن جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ سرکار کون ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا وہ فرضی شخص ہے اور اس کی نمائندگی صدر جمہوریہ کرتے ہیں اور صدر جمہوریہ کی طرف سے تمام کام کاج سکریٹری یا ان کا ماتحت عملہ کرتا ہے۔ اور صدر یا سکریٹری ان کا ماتحت عملہ عوام کے نمائندوں یا پارلیمنٹ کو جواب دہ نہیں ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرکاری ملازم پر کوئی بھی مقدمہ نہیں چل سکتا یہاں تک کہ وہ

کس کو قتل کر دے یا ڈاکہ ڈال دے تو بھی اس کے افسر اعلیٰ کی اجازت کے بغیر اس پر مقدمہ نہیں چل سکتا۔ البتہ اس کا یہ قدم اگر غیر سرکاری ہے تو مقدمہ چل سکتا ہے۔ گویا سرکاری ملازم عوام سے اس اعتبار سے بالاتر ہے کہ اس پر مقدمہ چلانے کے لئے چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جب کہ عوام پر بلاشرط مقدمہ چل سکتا ہے۔ گویا سرکاری ملازم بالکل محفوظ ہے کم از کم اس وقت تک جب تک کہ اس کا افسر اعلیٰ اس سے خوش ہے اس طرح حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے جن کو ہم چن کر بھیجتے ہیں اور جو عوام کے سامنے جواب دہ ہیں بلکہ ان اندیکھے ہاتھوں میں ہیں جن کو ہم عوام کا خادم کہتے ہیں۔ دراصل یہ صورت حال وہی ہے جو 1857 سے پہلے تھی جب اعلان کیا جاتا تھا ''خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔''

خلق آج بھی خدا کی ہے ملک عوام کا ہے اور حکم کمپنی بہادر (یعنی بابوؤں) کا ہے۔

اس طرح بڑی چالاکی سے بابوؤں خاص طور پر بڑے بابوؤں (سکریٹری) نے خود کو اصل حاکم کی حیثیت دے دی اور اپنے آپ کو نہ صرف مقدموں سے بلکہ جواب دہی سے بھی بچالیا۔ علاوہ ازیں بڑی چالاکی سے آئین میں ایک اور سوراخ کر کے دفعہ 311 بھی شامل کرالیا ہے اس دفعہ کے تحت کسی سرکاری ملازم کو کوئی ایسا حاکم برطرف نہیں کرسکتا جو اس کا تقرر کرنے والے کا ماتحت ہو۔ اور چونکہ گروپ ''بی'' سے اوپر کے تمام سرکاری ملازمین کا تقرر صدر کی طرف سے کوئی نہ کوئی سکریٹری دستخط کرتا ہے اور چونکہ تمام آئی اے ایس افسران متحد ہیں اس لئے کسی سکریٹری کو برطرف کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کسی کو یہ اختیار دینا کو وہ اگر چاہے تو خود کو برطرف کرلے۔

جہاں تک سرکاری ملازمین کے تیسرے اور چوتھے درجے کے ملازمین کا معاملہ ہے ان کی حیثیت ہی کیا ہے کہ وہ اپنے افسر کو ناراض کریں لہذا ان کی حیثیت تو غلاموں سے بدتر ہے اور آئین کے نفاذ کے بعد بھی وہ انگریزوں کے ''مقبوضہ

ملک'' ہندوستان میں رہتے ہیں۔

اصل مسئلہ ان لوگوں کا ہے جو'' بابوؤں کے زمرے'' میں نہیں آتے مگر سرکاری ملازم ہیں مثلاً ڈاکٹر، انجینئر، وکیل ایڈیٹر، سائنسداں اور دوسرے علمی اور تکنیکی ماہرین ان دانشوروں کے لئے چونکہ '' فکری قید و بند'' زہر کا کام کرتا ہے اور برسوں تک ایک طرح کے ماحول میں رہنے اور خاص انداز فکر اور طرز بود و ماند کے عادی ہونے کی وجہ سے ان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس '' غلامانہ طرز'' کو اختیار کرتے ہوئے کوئی '' ذہنی کام'' کرسکیں ذہین سرکاری ملازمین برباد ہورہے ہیں۔

اکثر اس طرح کی خبریں آتی ہیں کہ فلاں سائنسداں یا فلاں ڈاکٹر نے خودکشی کرلی۔ یہاں تک کہ بہار کے ایک سرکاری ڈاکٹر نے نہ صرف یہ کہ خودکشی کی بلکہ یہ بھی وصیت کی کہ اس کی موت کے بعد اس کا گوشت وزیر صحت اور سکریٹری صاحب کے پاس بھجوادیا جائے۔

انگریزوں نے ملازمین کے لئے ضابطہ اخلاق بنایا تھا۔ اور سرکاری کام کاج کے لئے ضابطے اور قاعدے مقرر کئے تھے جن پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا خاص طور پر ریکارڈ رکھنے اور باضابطہ طریقے پر کام کرنے اور تاخیر سے بچنے کی سختی سے ہدایت تھی جو ان کی خلاف ورزی کرتا تھا اسکی سزا ہوتی تھی۔

آزادی کے بعد سرکاری ملازم ان قواعد سے بھی آزاد ہوگیا ہے ان قواعد کا استعمال ان لوگوں کے خلاف ہوتا ہے جو اپنے افسر کو خوش کرنے کی بجائے ایمانداری سے اپنا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں۔

اس صورحال نے ہندوستان میں سوشلسٹ طرز حکومت کو ناکام بنادیا ہے اور اب آئین میں تبدیلی کے بغیر سرمایہ دارانہ طرز حکومت چلانے کی جو کوششیں ہورہی ہیں ان کا انجام پہلے سے بھی بدتر ہوگا۔ اصل خرابی نہ تو سوشلزم میں ہے نہ سرمایہ داری میں اصل خرابی بددیانتی میں ہے۔

چھوٹے، کمزور، غلامانہ ذہن کے لوگ کبھی کوئی بہتر اور نتیجہ خیز صورت حال

نہیں پیدا کر سکتے۔

لہٰذا آج کی سب سے پہلی ضرورت ہے کہ سرکاری عملے کو فعال ایمان دار اور ذمہ دار بنایا جائے۔ آئین کی دفعہ 300 کو ختم کیا جائے اور سرکاری ملازمین کو ہندوستان کے دوسرے عوام کے برابر کا درجہ دیا جائے۔ انہیں غیر ضروری برتری اور غیر ضروری کمتری کی صورت حال سے نکالا جائے۔

سرکاری ملازمین کو اپنے افسر اعلی کی مرضی کا پابند کرنے کی بجائے انہیں اپنے ضمیر آئین اور عوام کی مرضی کا پابند کیا جائے۔ آئی۔اے۔ ایس افسران اور ان کے ماتحت دیگر سرکاری عملے کو عوام کے سامنے جواب دہ قرار دیا جائے اور اس کے لئے مندرجہ ذیل اقدام ضرور ہیں۔

(۱) آئین کی دفعہ 300 ختم کی جائے۔

(۲) سرکاری ملازمین پر مقدمہ چلانے کے لئے اجازت کی شرط ختم کر دی جائے محض اطلاع کافی سمجھا جائے۔

(۳) سرکاری ملازمین اپنے افسر کو جواب دہ ہونے کی بجائے قانون کو جواب دہ ہو۔

(۴) اطلاعات حاصل کرنے کا حق عوام کو تفویض کرنے کے لئے آئین میں ترمیم کی جائے۔

(۵) سرکاری ملازمین کو 20 سال کی مدّت ملازمت کے بعد وظیفہ یابی کی جو سہولت ہے اس طرح کی سہولت 15 سال اور دس سال کی ترک ملازمت کے لئے بھی حاصل ہونے چاہیے۔

شرائط ملازمت، کام کا ماحول، ترقی کے امکانات، اور دیگر سہولتوں میں اضافہ کے ساتھ جواب دہی میں بھی اضافہ کیا جائے۔

اگر ایسا نہیں ہوا تو سوشلسٹ طرز کا جو حشر ہوا سرمایہ دارانہ طرز (جسے ہم بددیانتی کے ساتھ "رواداری یا کھلاپن کا نام دے رہے ہیں) کا اس سے بدتر انجام ہوگا۔

آر ایس ایس کے سماج پر اثرات

آر۔ایس ایس، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، شیوسینا اور اس طرح کی تمام فرقہ پرست جماعتوں اور ان سے متاثر لوگ سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنا کر دولت اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے ''ہندومت کے نام پر'' ''منوواد'' کی حفاظت اور سر بلندی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ جب تک مسلمانوں کو دبا کر اور ذلیل کر کے نہیں رکھا جائے گا اور ان کے اجداد کی طرف سے ہونے والے اصلی اور فرضی ظلموں کا انتقام ان سے نہیں لیا جائے گا ''ہندویت۔منوواد'' سر بلند نہیں ہوسکتا۔

انگریزوں کے خود غرض حکمراں طبقہ نے ہندوستان میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے مسلسل ڈیڑھ سو برس تک کوششیں کیں۔ انہوں نے کئی جھگڑے کھڑے کئے، کئی فرضی تاریخی کہانیاں مروج کیں اور ہندوستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں افتراق اور نفرت کا بیج بویا اس نفرت کی کھیتی کو دشمنی کے زہریلے پانی سے سیراب کرتے رہنے کے لئے انہوں نے کئی تنظیموں کی بنیاد رکھوائی۔اسی طرح کی ایک تنظیم تھی۔راشٹریہ سیویم سنگھ اور دوسری تنظیم تھی مسلم لیگ۔

۱۹۳۹ء میں آر ایس ایس کے گرو ایس ایم گولوالکر نے لکھا تھا:۔

''ہندوستان کے غیر ہندو لوگوں کو ہندو تہذیب اور زبان اختیار کرنی چاہئے۔ ہندو مذہب کا احترام کرنا چاہئے، ہندو نسل اور تہذیب کی ستائش کے سوا کوئی نظریات نہیں اپنانے چاہئیں یعنی انہیں نہ صرف اس سرزمین اور اس کی صدیوں پرانی روایات سے متعلق رواداری اور احسان فراموشی کا رویہ ختم کرنا چاہئے بلکہ اس سے

محبت اور اس کے لیے وقف ہونے کا مثبت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ انہیں اپنی بدیشی حیثیت ختم کردینی چاہیے یا پھر اس ملک میں وہ ہندو قوم کے تابعدار کی طرح رہ سکتے ہیں انہیں کسی قسم کی مراعات طلب کرنے کا حق نہ ہوگا۔ ترجیحی سلوک تو دور کی بات ہے انہیں شہری حقوق بھی حاصل نہ ہوں گے۔"

ہم اور ہماری قومیت کا ناقص اور فاشسٹ تصور گولوالکر نے ہٹلر کی تحریک سے حاصل کیا تھا۔ اُس نے "برتر آریہ نسل" کا نعرہ لگایا تھا اور جرمنی میں یہودیوں کا اس لیے قتل عام کیا تھا کہ وہ سامی نسل کے لوگ تھے۔ آریہ نہ تھے۔ اور چونکہ وہ سامی تھے اس لیے ان میں دنیا بھر کی خرابیاں تھیں۔ بالکل انہیں خطوط پر گولوالکر نے ہندوستان میں "برتر ہندو نسل" کا نعرہ لگایا اور مسلمانوں کو "غیر ملکی" کہا۔ غربت اور بیروزگاری میں مبتلا جرمنی قوم کے نوجوان ہٹلر سے بہت متاثر ہوئے اور جرمنی میں ہٹلر کی حکومت قائم ہوئی۔ یہودیوں کا قتل عام ہوا اور دنیا کو جنگ عظیم کا سامنا کرنا پڑا۔ جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاسا کی تباہ و برباد ہوگئے۔

گولوالکر کا "برتر ہندو نسل" کا نظریہ بھی انہیں خطوط پر استوار ہوا لگ بھگ 80 برسوں سے ملک بھر میں بہت زور وشور سے زبان وقلم کے ذریعہ اس نظریے کا پرچار ہو رہا ہے۔

"برتر ہندو قوم اور قابل نفرت مسلم قوم" کے خطرناک دو قومی نظریہ کی شروعات آر ایس ایس اور اس سے پہلے ہندو مہا سبھا نے کیا۔ مسلم لیگ نے اس نظریے کو نہ صرف درست تسلیم کیا بلکہ اسی بنیاد پر علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا۔ آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں جماعت اسلامی دو قومی نظریے کی حامی ہے۔ اور اردو زبان میں قوم جو پہلے ہم علاقہ لوگوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جیسے قوم پنجابیاں (اس میں ہندو مسلمان سبھی شامل تھے) وہ آج Nation کے معنوں میں استعمال ہو کر غلط فہمی کا سبب بن رہا ہے۔

تقسیم ہندوستان کے بعد آر ایس ایس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا۔ کانگریس

میں بھی اس نظریے کے پرچارک موجود تھے۔ ان لوگوں میں بااثر شخصیت سردار پٹیل کی تھی۔ جو وزیر داخلہ اور نائب وزیر اعظم بنے اور مرد آہن کہلائے۔ حالانکہ انھوں نے گاندھی جی کے قتل کے بعد آر۔ ایس ایس پر پابندی لگائی مگر یہ محض ایک مجبوری کا سکھاوا نظر آتا ہے۔ ورنہ یہی حجرت تھے جو مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی زمیں اس قدر گرم کرنے کی ہدایت دے رہے تھے کہ مسلمان خود بخود چلائے جائیں۔ اور ان کے قتل۔ م کی ضرورت نہ پڑے۔

برتر ہندو نسل اور کمتر مسلم قوم کے خطرناک نظریے کو کئی وجوہ سے بڑھاوا ملا ان میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی کی آمد کے بعد کانگریس کی زبان سے بھی دھارمک اصطلاحات نکلنے لگے اس سے پہلے خلافت تحریک کی زبان سے مذہبی اصطلاحات میں باتیں ہوتی ہی تھیں۔ اسی رجحان سے محمد علی جناح جیسا مذہبی ناطرفدار (سیکولر) بلکہ غیر مذہبی قانون پسند آزاد خیال لیڈر، کانگریس کی تحریک سے الگ ہو گیا اور پھر بالکل ذاتی دشمنی اور احساس کمتری کی بنیاد پر مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مذہبی جذبات کا استحصال کر کے آر ایس ایس کے دوقومی نظریہ کو تقویت دی۔ علامہ اقبال بھی جو مغرب کے سفر سے پہلے ترانہ ہندی لکھ رہے تھے، مغرب کے زیر اثر ترانہ ملی لکھنے لگے، گر انھوں نے ہندوستان سے الگ مسلمانوں کے لئے کسی ملک کی کبھی نہ تجویز رکھی نہ حمایت کی البتہ ہندوستان کے حدود میں مسلمانوں کی ایک الگ ریاست چاہتے تھے۔ اور وہ ریاست اور حکومت کے فرق سے واقف تھے۔

ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کی جنرل سکریٹری اجے گھوش نے ۱۹۶۱ء کی ستمبر میں قومی یکجہتی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بالکل درست کہا تھا کہ "یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہماری قومی تحریک کی نظریاتی بنیاد کمزور تھی اور اس کے سماجی و معاشی متن و مواد کو کبھی واضح طور پر متعین نہیں کیا گیا۔ قومی تحریک کے دوران جو پرچار اور اجی ٹیشن ہوئے اس کے بیشتر حصے پر ہندو مذہب سے متعلق رکھنے والے خیالات کی چھاپ تھی۔"

کانگریس جس نے تحریک آزادی کی قیادت کی تھی عوام کے سامنے ان سماجی

ومعاشی تبدیلیوں کی ٹھوس اور واضح تصویر پیش کرنے میں ناکام رہی جو آزادی کے بعد عمل میں لائی جانے والی تھیں۔''

ان کمزوریوں کے باوجود قومی تحریک وقت گذرنے کے ساتھ مضبوط تو ہوتی گئی، مختلف مذاہب کو ماننے والے اور مختلف خیالات رکھنے والے لوگ واحد مقصد کے حصول کے لیے متحد ہوگئے۔ یہ مقصد تھا بدیشی راج سے ملک کی نجات۔ اگر صرف دو فریضوں کی تکمیل کی جاتی تو اس اتحاد کو آزادی کے بعد برقرار رکھا جا سکتا تھا اور مزید ترقی دی جاسکتی تھی۔

اولاً عوام کے سامنے ایک ولولہ انگیز مقصد رکھا جاتا، یعنی ملک کو اس طرح دوبارہ تعمیر کرنے کا مقصد جس سے عوام کی وسیع اکثریت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوتا۔ امیری اور غریبی کے درمیان ہولناک فرق کا خاتمہ ہوتا۔ معاشی، سماجی اور سیاسی میدان میں ریڈیکل اصلاحات عمل میں لائی جاتیں۔

دوسرے یہ کہ ان مقاصد کو تیزی سے عملی شکل دینے کے لیے ٹھوس اقدامات کئے جاتے۔

لیکن کانگریس نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی، سردار پٹیل نے آر ایس ایس کے نظریے کی حمایت کی اس تنظیم کے بھی وہ سرپرست رہے۔

گاندھی جی کو ان فسطائیوں کی وجہ سے بہت دکھ پہنچا تھا انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی خفیہ اجلاس (جو نومبر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں منعقد ہوا) میں کہا'' شاید آپ مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے اور میں جانتا ہوں کہ آپ متفق نہیں ہوں گے لیکن میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو پانچواں کالم قرار دینے کی یہ ساری باتیں غلط ہیں۔ مجھے مزید دھوکہ نہیں دیا جاسکتا ،میں نے ہر چیز دیکھ لی ہے اور میں سب جانتا ہوں۔ آپ مسلمانوں کے لیے یہاں رہنا ناممکن بنا رہے ہیں اور آپ ان سے کہتے ہیں کہ یہیں رہو۔ میں ڈاکٹر کچلو کو کہاں بھیجوں؟۔ اس اجلاس میں اچاریہ کرپلانی نے کہا (۱) پاکستان کے خلاف جنگ کے لیے تیاری کی جائے۔ (۲) پاکستان میں ہندوؤں کے

تحفظ کی خاطر ہندوستان کی مسلم اقلیت کو یرغمال کے طور پر استعمال کیا جائے۔ (۳) اگر پاکستان میں ہندوؤں کو تحفظ حاصل نہ ہو تو مسلمانوں کو بڑے پیمانے پر ہندوستان سے نکال دینا چاہئے۔ (۴) مسلم لیگیوں سے پانچویں کالم کی طرح برتاؤ کیا جائے۔ (پیوپلس ایج مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۹۴۷ء سے شائع شدہ)

اس خفیہ اجلاس کی کارروائی کو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے شائع کیا تھا اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پولیٹ بیورو کے ممبر ڈاکٹر جی ادھیکاری نے لکھا تھا۔

''مسلم اقلیت کے فوری نوعیت کے مطالبات جیسے ان کی زندگی اور جائیداد کا تحفظ، ان کے مذہبی اور تہذیبی اداروں کی بحالی، اردو کا تحفظ وغیرہ کو مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیموں کو مستحکم بنا کر حاصل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ہماری سیاسی آزادی کو مستحکم بنانے اور ہمارے ملک میں جمہوریت کو عام کرنے کی مشترکہ جدوجہد میں مسلمانوں بشمول مسلم لیگیوں کو شامل کر کے ہی یہ مطالبات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔''

کانگریس کے خفیہ اجلاس نومبر ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے تحفظ کے بارے میں واضح موقف اختیار کیا گیا۔

کانگریسی لیڈروں آزاد، نہرو اور خاص طور پر گاندھی جی کی کوششوں نے مسلمانوں میں خود اعتمادی کو مستحکم بنانے میں بہت مدد دی۔

اس صحت مند روایت کو ہندوستان کے آئین کی تدوین نے مزید استوار کیا۔

ریاست کو مذہب سے علیحدہ کرنے اور حکومت کو مذہبی معاملات میں غیر جانبدار رکھنے کی آئین نے گنجائش فراہم کی۔ سیاسی غیر جانبداری، مذہبی غیر جانبداری اور مساوات ہمارے آئین کے تین بنیادی ستون قرار دیئے گئے۔

دستوری مجبوری کے سبب آر ایس ایس کو ''کلچرل تنظیم'' کا نقاب اوڑھنا پڑا۔ کچھ دنوں بعد اس کا ایک سیاسی محاذ جن سنگھ کے نام سے سامنے آیا۔

۱۹۶۵ء میں جنگ کے موقع پر لال بہادر شاستری نے آر ایس ایس سے سمجھوتہ

کر لیا اور اس تنظیم کو وقار اور اعتبار بخشا۔ سرکاری نظم و نسق میں آر ایس ایس کی گھس پیٹھ بڑھنے لگی۔

آر ایس ایس بنیادی طور پر ہندوستانی دستور کے تینوں ستون کے خلاف ہے۔ اسے مذہبی ناطرفداری (سیکولرازم) سیاسی غیر جانبداری (نیوٹرل ازم) اور مساوات (سوشلزم) تینوں سے نفرت ہے۔

اور اس نفرت کو پھیلانے کے لیے دوسری احیا پرست تنظیموں کے ساتھ مل کر آر ایس ایس مسلسل جہاد کرتی رہی ہے۔ مسلمانوں میں اس کی ہم خیال تنظیم جماعت اسلامی کے نام سے ان تینوں نظریات کی مخالفت کا زور دار پرچار کرتی رہی۔ جماعت اسلامی مذہبی ناطرف داری (سیکولرزم) کو لادینی قرار دیتی رہی۔ مساوات کو کمیونزم قرار دیتی رہی ہے اور سیاسی غیر جانبداری کو مکاری قرار دیتی رہی۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں اور سوویت یونین اور چین کو اسلام دشمن قرار دے کر ان سے مسلمانوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی جاگیردارانہ قیادت پاکستان میں بندربانٹ میں مبتلا تھی۔ روس کی موجودگی میں مسلم ممالک اس ابتلا سے محفوظ تھے جو آج ان کا مقدر بن گئی ہے۔ آج امریکہ ساری دنیا میں واحد قوت کی حیثیت سے جو چاہتا کرتا ہے۔ کاش مسلمانوں میں سیاسی بصیرت ہوتی۔

محمد علی جناح نے پاکستان کو ہندوستان کی طرح سیکولر سوشلسٹ جمہوریہ قرار دینے کی کوشش کی مگر خود انہیں ان کے ماننے والوں نے بالکل اسی طرح مسترد کر دیا جیسے گاندھی کو ہندوستان میں کیا گیا تھا۔ جب آپ قوم کی اکثریت کی ذہنی سطح بلند کیے بغیر اس پر ذمہ داریاں ڈال دیتے ہیں تو یہی ہوتا ہے۔

سیکولرازم کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجے گھوش نے قومی یکجہتی کانفرنس ۱۹۶۱ء میں کہا تھا۔ ”جو کچھ ہوا وہ یہ کہ ہم نے سمجھا ہمارا سیکولرازم خود بخود جڑ پکڑ لے گا اور سیکولر اصولوں کی خلاف ورزیوں کی جو اکثر واضح امتیازی عمل کی حد تک پہنچتی تھیں۔ نظر انداز کر دیا۔ یہ سننا بھی گوارا نہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا

امتیازی برتاؤ کیا جاتا ہے۔''

مسلمانوں میں جہالت اور معاشی پسماندگی کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ وہ آر ایس ایس اور جماعت اسلامی دونوں کے پروپیگنڈا سے متاثر ہوئے اور ہندوستان کے جمہوری، سیکولر سوشلسٹ قومی دھارے سے کٹ کر رہ گئے۔

آر ایس ایس اور جماعت اسلامی اور انگریزی دان مسلمان طبقے میں قومی دھارے کا مطلب یہ تھا کہ آر ایس ایس کے فلسفہ کو تسلیم کرلیا جائے۔ ہندوؤں کو برتر نسل اور مسلمانوں کو کمتر قوم سمجھ کر سر تسلیم خم کردیا جائے، اور آر ایس ایس کے تابعدار بن کر ہندوستان میں زندگی گزارنے کی کوشش کی جائے۔

مسلمانوں کے ایک بہت چھوٹے سے گروہ نے اس کی کوشش کی بھی عبدالکریم چھاگلہ اور حمید دسوئی اس کی روشن مثالیں ہیں۔ اور نقوی اس کی بدترین مثال ہیں۔

سکندر بخت آخری عمر میں آر ایس ایس کی چالاکی سمجھ گئے تھے اور اس انھوں نے کئی بار نجی مضفلوں مین اظہار بھی کیا۔

سیکولر جمہوری اور سوشلسٹ خیال کے لوگ چینی حملے کے بعد اس طرح ٹوٹ گئے کہ وہ اس سمت میں کوئی نمایاں اقدام نہ کر سکے وہ قومی مسائل سے زیادہ بین قومی مسائل کی طرف توجہ کرنے لگے۔ اور ان میں بھی مفاد پرستوں کا ایک حلقہ زیادہ سر گرم ہوگیا۔

انہوں نے صحیح ڈھنگ سے یہ بات بتانے کی کوشش بھی نہیں کی کہ سیکولرازم، سوشلزم اور نیوٹرل ازم کے تصورات پر بنی دھارا ہی قومی دھارا ہے، اور اس کا ہندو راشٹر یا ہندوؤں کی تابعداری سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ترقی پسندوں کے ایک ھلقے نے اردو دشمنی کو شعار بنالیا۔ ترقی پسند تحریک کے کمزور ہونے کی کئی وجوہ مین ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ ابھی حال مین نامور سنگھ نے کہا ہے کہ اگر اردو کمزور ہوئی تو ہندی بھی کمزور ہوگی مگر یہ نامور سنگھ ہی تھے جنھوں نے باسی بھات میں ساجھا کی بات کی تھی۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد، سیکولر سوشلسٹ دھارے کے ساتھ مل کر اس دھارے کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتی، مگر وہ اپنی جہالت اور پس ماندگی کے سبب اس دھارے سے کٹتے چلے گئے۔

ایک جدید اور جمہوری ہندوستان کی تعمیر کی خواہش رکھنے والے تمام لوگوں کے لیے یہ بات فکرمندی کا باعث رہی ہے کہ ہماری آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ (مسلمان کی بڑی تعداد) قومی دھارے سے الگ رہا۔ دوسری طرف فرقہ پرست طاقتیں خاص طور پر آر ایس ایس اور جماعت اسلامی بڑے منظم ڈھنگ سے قومی دھارے کی غلط تعبیریں کرتی رہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہت بڑے حصے کو اس دھارے سے دور رکھا ہے۔

مسلمانوں میں جو کہ دستور کے تحت مساوی حقوق رکھنے والے شہری ہیں ان کی جان و مال کی سلامتی کا بھرپور احساس پیدا ہونا چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ غالباً کسی چیز نے مسلمانوں میں اتنی پست حوصلگی پیدا نہیں کی جتنی کہ فسادات کے متواتر پھوٹ پڑنے سے ہوئی۔

اصل میں فساد کی اصطلاح کا استعمال ہی غلط ہے۔ حقیقت میں مسلمانوں پر منظم ڈھنگ اور منصوبہ بند طریقے سے حملہ کو فساد کہا جاتا رہا ہے۔ فسادات عوامی جنون کا خودرو اظہار نہیں ہیں۔ منظم فرقہ پرست ٹولے مسلمانوں پر حملے کرنے کے لئے حالات پیدا کرتے ہیں یا ان کا استعمال کرتے ہیں۔ نظم و نسق کا ڈھانچہ (انتظامیہ پولس نیم فوجی جماعتیں) جس میں قابل لحاظ حد تک آر ایس ایس کی قسم کے فرقہ پرست عناصر شامل ہیں عام طور پر اپنی ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہتا ہے۔ اور اس فرقہ وارانہ تشدد منظم کرنے والوں کی بالواسطہ یا راست حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ (سکھوں کے خلاف فساد میں ہم نے فوج پولیس اور عوام کے کردار کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس وقت ان کی انسانیت حیوانیت میں بدل جاتی ہے تاہم ملک میں انصاف پسند اور رحم دل لوگوں کی بھی بری تعداد موجود ہے جو اپنا نقصان اٹھا

کے بھی اس فساد اور لوٹ مار مین شامل نہیں ہوتی)

جون ۱۹۶۸ء میں سری نگر میں قومی یکجہتی کونسل کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے بھیش گپتا نے کہا تھا "ہماری پارٹی کا یہ نقطہ نظر یہ ہے کہ آر ایس ایس اور جن سنگھ جیسی فرقہ پرست تنظیمیں بیشتر فرقہ وارانہ ہنگاموں کی ذمہ دار ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ وزارت داخلہ کے نوٹ میں اس کا ذکر ہی نہیں ہے۔"

انہوں نے مطالبہ کیا کہ فرقہ وارانہ تشدد کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ (۱) نظم ونسق کو فرقہ پرست عناصر سے پاک کیا جائے۔ (۲) فرقہ وارانہ پروپیگنڈے پر پابندی لگائی جائے (۳) آر ایس ایس جیسی تنظیموں اوراس قسم کی دوسری نیم فوجی تنظیموں کو دبایا جائے ۔(۴) انٹلی جنس کے نظام میں پوری طرح ردوبدل کیا جائے۔(۵) فسادات کے سلسلے میں ضلع افسروں کی ذمہ داری کا تعین کیا جائے۔(۶) جب بھی فساد ہو اس کی پبلک انکوائری کی جائے۔(۷) تعلیم کو سیکولر بنایا جائے اور نصابی کتابوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ (اب جب سے میڈیا نے جہاں ترقی کی ہے فساد کتے خلاف ماحول بن رہا ہے مگر میڈیا کا ایک حلقہ جو آر ایس ایس کے فلسفے کے زیر اثر ہے آج بھی مسلم دشمی اور مسلمانون کے خلاف نفرت کی فضا بنا رہا ہے گرچہ روزگار کے مواقع بڑھنے کی وجہ سے نوجوانوں کی مصروفیت بڑھی ہے اور فرقہ پرست کے ماحول مُن کچھ کمی آئی ہے۔)

بنگلہ دیش کے بعد فاشسٹ تنظیموں کو دھکا پہنچا۔ فسادات میں کمی آئی۔

مسلمانوں کو انگریزوں کے دور سے ہی انتظامیہ، سرکاری دفتروں اور نجی اداروں میں ملازمتوں کے مناسب مواقع نہیں دئے گئے ۔ تاہم بعد کے زمانے میں سرسید تھریک کے زیر اثر ان کو خاصی تعداد میں سرکاری ملازمتوں میں رکھا گیا مگر آزادی کے بعد ان کی بڑی تعداد پاکستان چلی گئی۔ آزادی کے بعد وزیر داخلہ کے نوٹی فی کیشن کے تحت وزارت داخلہ میں اہم عہدوں پر مسلمانوں کی تقرری بند تھی۔ تعصب منافرت، بیروزگاری اور جہالت کی وجہ سے مسلمانوں میں ہندو نوجوانوں کی بہ نسبت

زیادہ احساس محرومی پیدا ہوئی۔

۱۹۶۹ء میں کانگریس کی پھوٹ کے بعد اندرا گاندھی نے تیزی سے ترقی پسندانہ اقدامات کیے مثلاً بنکوں کا قومیانہ، جیب خاص کا خاتم وغیرہ۔ مسلمانوں نے کھل کر اندرا گاندھی اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا ساتھ دیا۔ مگر اسی زمانے میں مسلمانون کے ایک حلقے نے کانگریس کی بجائے خود اپنی پارٹی بنا کت اور دوسرے کانگریس مخالف حلقوں سے م کے کانگریس سے مسلمانون کو دور کرنے کی کوشش کی ۔اور اس کا جہاں کچھ اثر ہوا وہاں کچھ خراب اثر بھی ہوا۔

جن سنگھ آر ایس ایس اور دوسری فرقہ وارانہ طاقتوں نے مسلمانوں کو سبق سکھانے کے لیے بھیونڈی، احمد آباد اور کئی مقامات پر منظم حملے کیے، جن کو فساد کا نام دیا گیا۔

مسلم پرسنل لاء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار، اردو اور اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگا کر کانگریس اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے مسلمانوں کو بدظن کرنے کی کوششوں میں مسلم فرقہ پرتی، شدت سے مصروف ہوگئی۔ اسمبلیوں کے چناؤ کے موقع پر مسلم فرقہ پرست نے مسلمانوں اپیل کی کہ "کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کے خلاف اور جن سنگھ کی حمایت میں ووٹ دیں۔" مسلم فرقہ پرتی نے ہندو فرقہ پرتی کے اس الزام کو درست تسلیم کرلیا کہ مسلمان من حیث الجماعت ووٹ دیتے ہیں مسلمانوں کی انفرادی اور اپنی رائے نہیں ہوتی، وہ ووٹنگ کے معاملے میں بھیڑ چال کے شکار ہوتے ہیں اس طرح مسلم ووٹ بنک کا فسانہ گھڑا گیا۔

شمالی ہندوستان میں یوپی، دہلی، بہار اور مدھیہ پردیش میں ہندو فرقہ پرتی اور مسلم فرقہ پرتی دونوں کو پھیلانے کی زبردست کوشش جاری رہیں۔ مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور مسلم مجلس نے ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کی سودا بازی کے موقف کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

اندرا گاندھی کی پالیسیوں اور پروگرام کو بیوروکریسی اور ان کے سیاسی آقاؤں

نے اپنی بدعنوانی اور نا اہلی کے سبب پوری طرح سبوتاژ کر دیا۔ پورا ملک معاشی دیوالیہ پن کے کنارے پر آ کھڑا ہوا۔ انصاف، قانون، امن اماں، جہالت اور غربت کی صورت حال بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اس کے بعد جے پرکاش نرائن اور دوسرے لوگوں نے جہاد چھیڑ دیا۔ مسلم نوجوان بڑی تعداد میں اس میں شامل ہوئے۔

پھر ہنگامی حالات کا اعلان ہوا اس میں شہروں کو صاف ستھرا بنانے اور فیملی پلاننگ کے تحت نس بندی کرانے کے پروگرام پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا، اور اس کو جبراً نافذ کرنے کی کوشش کی گئی اس ظلم و زیادتی سے مسلمان خاص طور پر متاثر ہوئے۔ اس لیے کہ پرانے شہروں میں مسلمانوں کی آبادیاں زیادہ تر سلم (SLUM) بن چکی ہیں۔ سلم کی صفائی کا مطلب تھا مسلمانوں کو اجاڑنا اور غربت اور جہالت کے سبب سے مسلمانوں کے یہاں فیملی پلاننگ کو برا سمجھا جاتا رہا ہے اس لیے جبری نس بندی سے بھی وہ بہت پریشان ہوئے۔ اندرا گاندھی نے ہنگامی حالات کے تحت مسلمانوں کی فلاح بہبود کے کئی پروگرام چلائے۔ فرقہ پرست جماعتوں آر ایس ایس اور جماعت اسلامی پر پابندی لگا دی۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے دوسرے ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر اندرا گاندھی اور کمیونسٹ پارٹی کے خلاف ووٹ دیا۔ حالانکہ ایمرجنسی میں سلم کی صفائی اور نس بندی کے معاملے میں ہونے والی زیادتیوں کے خلاف ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے جم کر کانگریس کی مخالفت کی تھی۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے اخبارات "حیات" "جن یگ اور نیو ایج" نے سنجے گاندھی اور ان کے حواریوں کی سلم صفائی اور نس بندی مہم پر زبردست حملے کیے۔ (میں اس زمانے میں دہلی ڈائری لکھتا تھا حیات کے اس وقت کے صفحات گواہ ہیں کہ جامع مسجد کو بچانے میں ان تحریوں کا کیا ہاتھ تھا۔ اگر اس طرح کی تحریریں نہ آتیں اور پھوپیش گپتا کو ان علاقوں مُں گھما کر، تو آب بستوں اور جامع مسجد کا دورہ نہ کرایا جاتا تو اس نہ جامع مسجد کا علاقہ باقی ہوتا نہ جے جے کالونیاں وجود میں آتیں۔ ہماری معمولی سی کوشش نے ملکی اور بین اقوامی حالات میں تبدیلی کر دی۔ س طرح سے

تصویر نے ان معاملات کو قومی اور بین قومی سطح پر نمایاں طور پر پیش کیا اور یہ ہندوستانی کمیونسٹ کا ہی قومی اور بین قومی سطح پر دباؤ تھا کہ جامع مسجد کا علاقہ اور شہروں کے پرانے سلم باقی رہ گئے۔ کمیونسٹ اور کانگریس اشتراکیت میں دراڑیں پڑ گئیں۔ ہندوستانی پارلیمنٹ اور بین قومی سطح پر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے کانگریس پر سوویت یونین سے دباؤ ڈلوایا۔ اندرا گاندھی جو بنیادی طور پر ایک نیک خاتون تھیں ملک کے بگڑتے حالات اور خاص طور پر گاندھی وادیوں کی خودسوزی سے پریشان تھیں۔ بین قومی سطح پر تمام ملکوں کا ان پر دباؤ تھا صرف سوویت یونین اور کمیونسٹ بلاک ہی ان کی حمایت کر رہا تھا۔ ملکی سطح پر بھی صرف ہندستانی کمیونسٹ پارٹی ان کے ساتھ تھی۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی خلاف تھی۔ اندرا گاندھی کو مجبور ہو کر چناؤ کرانا پڑا۔

مسلمانوں نے اندرا گاندھی کے خلاف ووٹ دیا۔ وہ ہار گئیں۔ اور گوشہ گیر ہو گئیں۔ مگر فرقہ پرست اور رجعت پرست طاقتیں جو برسر اقتدار آگئی تھیں اندرا گاندھی کے خلاف انتقامی کارروائیوں میں مصروف ہو گئیں۔ عوام اندرا گاندھی کے خلاف نہ تھے ان کی ترقی پسند پالیسیوں کے خلاف نہ تھے وہ ایمرجنسی کی زیادتیو کے خلاف تھے۔ وہ فرقہ پرستوں کی نااہلی آپس میں ناانصافی سے بیحد پریشان ہوا ٹھے اور عام چناؤ میں ایک بار پھر کانگریس برسر اقتدار آگئی۔ اس بار اندرا گاندھی نے اپنے پرانے حلیف مسلمانوں اور کمیونسٹوں سے دور رہ کر فرقہ پرستوں اور خاص ور پر آرایس ایس سے ہاتھ ملایا۔ اب اندرا گاندھی انتقام پر آمادہ عورت تھیں۔ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح انہوں نے کسی بھی طرح اقتدار حاصل کرنے کی تہیہ کیا اس کام میں سنجے گاندھی نے ان کی کافی مدد کی وہ برسر اقتدار آگئیں۔

ملک کا حال بد سے بدتر ہوتا گیا، جہالت اور غریبی بڑھتی چلی گئی۔ جہالت، غریبی، فرقہ پرستی اور بدعنوانی (کرپشن) ہندوستان کی چار بڑی بیماریاں ہیں۔ اور ان کو جب تک ایک ساتھ دور کرنے کی کوشش نہیں ہوگی، ملک کے حالت سدھر نہیں سکتے۔ جہالت، غربت، فرقہ واریت اور بدعنوانی پر چاروں ایک دوسرے

کو تقویت دیتی ہیں۔ جہالت سے فرقہ واریت، غربت اور کرپشن کو بڑھاوا ملتا ہے۔ کرپشن سے فرقہ واریت، جہالت اور غربت کو تقویت ملتی ہے اور غربت سے جہالت فرقہ واریت کرپشن کو بڑھاوا ملتا ہے۔

انگریزوں نے ملک کی معاشی اقتصادی اور صنعتی ترقی کی طرف کوی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے فرقہ واریت، جہالت بدعنوانی اور غربت کو پیدا کیا اور ان کی پرورش کی۔ ملک کا معاشی، غیر فرقہ وارانہ، تعلیمی اور غیر بدعنوانی ڈھانچہ توڑ دیا۔

نیم انگریزی خواندہ طبقہ ذہنی دیوالیہ پن کا شکار تھا ان کی اخلاقی حالت بدتر تھی اور اس کا اظہار انگریزوں کے زمانے میں ہی بعض سیاحوں مثلاً جانی گستاول نے اپنی تحریروں میں کیا تھا۔

انگریزوں نے جو کلرکوں کا طبقہ پیدا کیا اور جس نوکر شاہی کی تشکیل کی اور قانون کا جو ڈھانچہ تیار کیا، اس سے انگریزوں کو فائدہ ہوا مگر ملک کے عوام کی کمر ٹوٹ گئی۔

آزادی کے بعد نہ تو فرقہ واریت نہ جہالت، نہ غربت اور نہ ہی کرپشن کے خلاف کوئی ٹھوس اقدام کیا گیا۔ بیوروکریسی کا ڈھانچہ اور قاعدے قانون وہی رہے جو انگریزوں نے جاری کیا۔ اسے ہندوستانیت یا مشرقیت سے دور ہی رکھا گیا۔

پنڈت نہرو نے گاندھی جی اور دوسرے مشرقی فلسفیوں کے انداز فکر کو بالکل نظر انداز کر دیا اسی طرح ملک کی تعمیر نو کا کام ڈھپ ہو کر رہ گیا۔

پنڈت جی عملاً انگریز تھے انہوں نے انگریزوں کی طرح قاعدے قانون اعتدال پسندی اور وضع داری کو برقرار رکھا اور اس طرف بالکل توجہ نہیں دی کہ جب تک بیوروکریسی کا ڈھانچے اور قاعدے قانون کو تبدیل کر کے اسے ہندوستانی عوام کے موافق نہیں کیا جائے گا ملک سے (۱) جہالت، (۲) فرقہ واریت (۳) غربت اور (۴) بدعنوانی دور نہیں ہو سکتی۔

پنڈت جی کی معاشی پالیسی بھی غلط تھی۔ انہوں نے چھوٹی صنعتو کی بجائے بڑے کل کارخانوں کی تعمیر اور نہروں اور کنوؤں کی تعمیر کی بجائے بڑے بڑے

باندھوں (ڈیم) کی تعمیر کی طرف توجہ کی۔

(۱) جہالت (۲) فرقہ واریت (۳) غربت اور (۴) بدعنوانی پنڈت جی کے نزدیک کوئی مسئلہ ہی نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ پنڈت جی کو ہندوستان سے زیادہ بیرونی ملک کے معاملات دلچسپی تھی وہ ہندوستان کے تو محبوب تھے ہی دوسرے ملکوں کے بھی لیڈر بن گئے۔

پنڈت جی جذباتی قاعدے قانون کے پابند اور وضع دار آدمی تھے۔ چین ان کا دوست تھا۔ جب چین نے حملہ کیا تو اس سے انہیں زبردست صدمہ پہنچا یہ ان کی انسانیت وضع داری، جذباتیت اور بین قومی یا خارجہ پالیسی پر حملہ تھا جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔

شاستری جی کو اقتدار سنبھالتے ہی پاکستان سے جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں ملک کی طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہ ملا۔ جنگ کے دوران انہوں نے گھبرا کر آر ایس ایس سے ہاتھ ملا لیا، اور اس طرح پہلی بار فرقہ پرستی کو وقار ملا۔ اور فرقہ پرستی جو سردار پٹیل کے زیر سایہ بیوروکریسی میں اپنے ڈیرے جما چکی تھی ساشتری کے مختصر دور میں اور زیادہ مستحکم ہوئی۔

اندرا گاندھی کے آخری زمانے میں فرقہ پرستی کو مزید تقویت ملی۔ اندرا گاندھی اپنے دور اقتدار کے آواخر میں ایک بار پھر مسلمانوں کے مسائل کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اور سنجیدگی سے فساد، زبان، جہالت اور غربت کے مسائل کی حل کی طرف متوجہ ہوئیں۔ لیکن اندرا گاندھی بیوروکریسی کے ڈھانچہ کے سامنے بے بس تھیں۔ انہوں نے چناؤ میں جیتنے کے لیے ایک بار پھر فرقہ واریت کی طرف توجہ کی۔ وشو ہندو پریشد کی حوصلہ افزائی بلکہ تشکیل کی اور سکھ ہندو فرقہ واریت کو بڑھاوا دیا اور آخر کار اسی فرقہ پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئیں۔

راجیو گاندھی ایک نیک مگر نا تجربہ کار نوجوان تھے۔ وہ اپنی والدہ کی بنسبت کمزور قوت فیصلہ کے مالک تھے اور آخری ایام میں انہوں نے ہندو فرقہ واریت

کے سہارے اپنی کشتی پار لگانے کی پالیسی اختیار کی۔ غالباً ایسا ارون نہرو کے زیر مشورہ کیا کہ ارون نہرو آر ایس ایس سے متاثر تھے اور آج وہ اسی کی ذیل اُرٹ مین ہیں۔ راجیو گاندھی پورے طور پر سیکولر تھے مگر ان کے چند مشیروں نے انھیں اندھیرے میں رکھا اور سکھ دشمنی کے ساتھ ساتھ مسلم دشمنی کی پالیسی نے اپنی بدترین شکل اختیار کر لی۔

راجیو کے دور میں غربت اور جہالت تو کیا دور ہوتی فرقہ واریت اور کرپشن کو زبردست بڑھاوا ملا۔ ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ مگر راجیو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کمپیوٹر اور غیر ملکی سرمائے کو بڑھاوا دیا جس کی وجہ سے فی الحال تو ملک اور نوجوانوں کا راحت ملی ہے۔

پھر وی پی سنگھ سامنے آئے۔ وہ نیک اور مہاتما آدمی ہیں اس کے ساتھ ساتھ باصلاحیت اور ایثار پیشہ بھی ہیں۔ انہوں نے جے پرکاش کی طرح تمام پارٹیوں کو ضم کر کے ایک اپوزیشن پارٹی بنانے کی بجائے تمام اپوزیشن پارٹیوں کا متحدہ محاذ بنانے کی کامیاب کوشش کی۔

وشوناتھ پرتاب سنگھ فرقہ واریت، غربت اور کرپشن دور کرنے کے نعرے کے ساتھ میدان میں آئے ہیں۔ لیکن فی الحال ان کے سامنے کشمیر اور پنجاب کے دو بھیانک خطرے ہیں جن میں وہ اس طرح الجھ گئے ہیں کہ کسی اور معاملے کی طرف پوری توجہ نہیں دے پا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اور متضاد پارٹیوں کے محاذ کو قابو میں رکھنے کا مشکل کام بھی انہیں دیکھنا پڑتا ہے، تاہم وہ ملکی معاملے کی طرف کانگریس کی سرکار سے زیادہ متوجہ ہیں۔ ان کی پالیسیاں امید افزا ہیں۔ لیکن ان کا دور ایک زبردست خطرے سے بھی دوچار ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ ملک میں فرقہ واریت خاموشی کے ساتھ بیوروکریسی میں تیزی سے اپنی جگہ بنا رہی ہے۔ سردار پٹیل اور شاستری کے زمانے کے بعد اب ایک بار پھر آر ایس ایس اقتدار کی گلیوں میں اپنا سر بلند کر کے گھوم رہا ہے۔ ملک ایک خطرناک دور سے پر کھڑا ہے۔

انسانیت کا چاروں دشمن جہالت، غربت، بدعنوانی اور فرقہ واریت کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔ ملک قرضوں میں ڈوب چکا ہے۔ تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ قاعدے قانون اور بیوروکریسی کے پرانے ڈھانچے کو دور کر کے کرپشن پر قابو پانے کے لیے کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ فرقہ واریت اقتدار کے گلیوں میں گھوم رہی ہے۔

ملک کے سیکولر اور جمہوریت پسند لوگوں اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے سر پر زبردست خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اسے مسائل جو سرے سے مسئلے ہی نہیں ہیں قومی منظر پر ابھار کر سامنے لائے جا رہے ہیں۔ (مثلاً بابری مسجد، رام جنم بھومی کا مسئلہ)۔

آر ایس ایس کا سب سے خراب اثر جو معاشرے پر پڑ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ جو صدیوں سے پھل پھول رہا تھا اس کے تانے بانے اب ٹوٹ رہے ہیں آپس میں منافرت پیدا ہو رہی ہے۔

ایسی صورت میں ملک کے دانشوروں اور خاص طور پر ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہمارے چاروں دشمنوں کے خلاف جنگ آزما ہوں، اپنے قلم اور زبان سے ان چاروں کے پوشیدہ چہروں سے نقاب اٹھائیں۔ ☆☆☆

1881 میں ہند کی کل آبادی ساڑھے 25 کروڑ تھی۔ 19 کروڑ 90 لاکھ برطانوی ہند اور ساڑھے 5 کروڑ ریاستی حکومتوں میں آبادی تھی۔

۱۔ اصل باشندے۔ ایک کروڑ اسی لاکھ

۲۔ آریا (برہمن اور راجپوت) ایک کروڑ ساٹھ لاکھ

۳۔ مخلوط نسل یعنی ہندو۔ بارہ کروڑ چالیس لاکھ

۴ اہل اسلام۔ چار کروڑ دس لاکھ۔ یہ برطانوی ہند کی آبادی کا تناسب ہے۔ ریاستوں کی آبادی کا تناسب بھی ایسا ہی تھا۔

اختر انصاری، شخصیت اور فن

اختر انصاری کو پڑھنے کا جنون تھا اور کثرت مطالعہ کے ساتھ ساتھ جذباتیت اور تخیل کی بلند پروازی نے ان کے اعمال وافعال کو سماج کے دوسرے متوازن افراد کے اعمال وافراد سے قدرے مختلف اور غیر معتدل بنادیا تھا۔ اکثر بڑے فنکاروں اور مطالعہ (خاص طور پر ادب کے مطالعہ) میں غرق رہنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان کے اعمال نارمل نہیں رہتے، گو بظاہر وہ نارمل نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر حالات سازگار ہوئے اور کوئی خضر راہ ملا تو انہیں زندگی میں وہ کامیابیاں بھی مل جاتی ہیں جن کو سماج میں کامیابی کہا جاتا ہے، ورنہ عامہ طور پر پڑھاکو اور جذباتی لوگ گوشہ تنہائی میں دوسروں کی نظر میں ناکام اور اپنی نظر میں کامیاب زندگی گذار دیتے ہیں۔

اختر انصاری کو اس طرح کا کوئی دست گیر نہیں ملا۔ وہ آئی اے ایس کے امتحان کی تیاری کے لیے ۱۹۳۱ء میں لندن گئے تھے مگر والد کے انتقال کے سبب واپس آگئے یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ اختر انصاری جس کروفر، نظم وضبط اور شان وشکوہ سے رہتے تھے۔ وہ کسی آئی اے ایس افسر کے طرز رہائش کی طرح تھا، اور شاید اس طرح اختر انصاری اپنی اس محرومی کو دور کرنے کی لاشعوری کوشش میں مصروف تھے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کہتے ہیں:۔

''ان کی شخصیت ایسی منفرد تھی کہ لوگوں کے ہجوم میں بھی نظر ان پر ہی جا کر ٹکتی تھی۔ گہرے ہرے رنگ کا کوٹ، گہرے سرخ رنگ کی ٹائی، کسی گہرے رنگ کا

پتلون منہ میں سگار، عینک لگائے، رفتار معتدل اور بے نیازانہ خراماں خراماں یونیورسٹی کی سڑکوں پر ٹہلتے نظر آتے، کپڑوں کی صفائی اور اہتمام کا یہ حال کہ نہ کوئی دھبہ نظر آئے گا اور نہ کوئی شکن۔

ان کا کمرہ میوزیم ہے جہاں انواع واقسام کی نادرونایاب چیزیں نظر آئیں گی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے تھے پڑھانے کے دوران ماضی کے حالات کی طرف مراجعت کا رجحان تھا۔

مشرف علی صدیقی کہتے ہیں:۔

''مختلف قسم کے سگریٹ مہمانوں کے لیے رکھتے تھے اور کمرے کی دیواروں سے لگی بڑی بڑی الماریاں ادبی وسیاسی اخبار کی فائلوں، دستاویزات رسائل وکتب سے بھری ہوئی تھیں۔ ان چیزوں کی حفاظت اور صاف ستھرا رکھنا ان کا اولین فرض تھا۔ تعطیل کے دوران وہ خود ان کی گرد پوشی کرتے اور جن اصحاب کو اس میں سے مطالعہ کے لیے کچھ درکار ہوتا اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ سیاسی دستاویزات آج بھی انمول ہیں۔

انہوں نے اپنے پیشہ اور فن سے کبھی دغا نہیں کی۔ بہترین استاد کی مثال قائم کی۔ ایک ہی وقت میں مذہبی، سیاسی، ادبی وسماجی، مسئلوں پر گفتگو کی نبضوں کو محسوس کرتے تھے۔ فلم بینی، کھانے پینے اور شان سے رہنے کا ایک خاص سلیقہ تھا۔

ان کا حافظہ اتنا تیز تھا کہ حوالے دیتے ہوئے تاریخ ومورخ تک بتادیتے تھے۔''

شہپر رسول کہتے ہیں:۔

''وہ گذشتہ پچاس پچپن سالوں سے ادب کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے بدترین حالات میں بھی انہوں نے کسی بھی مرحلے پر اپنے اس انہماک میں کمی نہیں آنے دی۔ انہوں نے بقول خود پانچ سو برسوں کے اردو ادب میں کوئی قابل مطالعہ چیز ایسی نہیں تھی جو نہ پڑھ لی ہو اس کے ساتھ انگریزی اور اس کے توسط سے

فرانسیسی، روسی، جرمن اور دیگر کئی یورپی زبانوں کا ادب بالخصوص فکشن کثرت سے پڑھا تھا۔

شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر پروفیسر وارث کرمانی کا کہنا ہے ''اردو، فارسی، انگریزی، ان تینوں زبانوں کے ادب کا جہاں تک تعلق ہے، اختر انصاری کے علم وواقفیت کی حد کو کوئی مشکل سے پہنچے گا۔''

اختر انصاری نہایت وضعدار آدمی تھے ہر کام کرنے کا ان کا جدا انداز تھا ان کے سونے جاگنے، پڑھنے لکھنے، کے اوقات کبھی تبدیل نہیں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ بازار سے خریداری کے لیے بھی کچھ دکانیں مخصوص تھیں۔

اچھا لباس، اچھے لوگ اور اچھی صورتیں ان کو پسند تھیں، مطالعہ کا جنون، جذباتیت، تخیلی دنیا میں غرق رہنے کی عادت، انفرادیت پسندی، بے نیازی، غیر منتقامانہ ذہن اور کئی اہم ناکامیوں، المیوں، اور سازش کرنے والوں کی مذموم حرکتوں کی وجہ سے مسلسل نقصانات کی ضربوں نے انہیں مجروح کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان میں جوڑ توڑ، موقع پرستی، خوشامد، کامیابی کے لیے مسابقت کی چوہا دوڑ سے اجتناب نے بھی انہیں نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن اختر انصاری جیسے لوگوں کا یہی مقدر رہا ہے۔

انہوں نے اپنے آخری شعری مجموعے کا نام احسن کلیم کے مندرجہ ذیل شعر سے اخذ کیا تھا۔

عمر تو کاٹ دی سائے میں سیہ بختی کے
اب تباہی کی طرف ایک ''قدم اور سہی''

اس سیہ بختی میں حالات کے ساتھ ساتھ خود اختر انصاری کی شخصیت اور عادات کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی شخصیت اور عادات کی تعمیر میں بھی حالات کا گہرا اثر تھا۔

اس سلسلے کا پہلا موڑ تو وہ تھا جس کا پہلے ذکر ہو گیا ہے۔ یعنی کہ وہ آئی اے ایس کی تکمیل کئے بغیر والد کے وفات کے سبب لندن سے واپس آ گئے۔ پھر ۱۹۳۳ء میں

انہوں نے قانون کا مطالعہ کر کے وکیل بننے کی کوشش کی کہ آئی اے ایس کے بعد وکیلوں کا ہی سماج میں مرتبہ ومقام تھا۔ مگر حالات کے جبر نے انہیں قانون کا مطالعہ بھی پورا نہیں کر دیا۔ مجبوراً وہ ۱۹۳۴ء میں اسکول ٹیچر ہو گئے۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں اردو میں ایم اے پاس کیا اور شعبہ اردو میں بحیثیت لکچرر متقرر ہوئے۔ تین سال بعد انہیں یونیورسٹی کا شعبہ اردو چھوڑنا پڑا۔ وہ ٹیچرز ٹریننگ کالج میں چلے آئے جہاں سے ۱۹۷۱ء میں بحیثیت لکچرر وظیفہ یاب ہوئے۔ زندگی میں تیسری بڑی اور گہری چوٹ یہ تھی کہ وہ نہ تو ریڈر ہو سکے، نہ پروفیسر، یہاں تک کہ شعبہ اردو میں لکچرر تک نہ رہ سکے۔ اور اس کا سبب یہی تھا کہ اپنی انفرادیت، انا پرستی، عزلت نشینی اور مطالعہ کے جنون میں وہ ارباب حل وعقد کی دربا داری اور خوشامد سے دور رہتے تھے رشید حسن خاں کہتے ہیں:

ان میں ایک بڑی خوبی اور دنیاوی لحاظ سے خامی یہ تھی کہ وہ منافق نہیں تھے، جوڑ توڑ، بھاگ دوڑ، گروپ بازی اور ایسی ہی دوسری قابل نفرت مگر فائدہ رساں صلاحیتیں انہوں نے پائی ہی نہیں تھیں۔ ان صداقت آشوب لیکن نفع بخش کرتب اور کرتوت سے ان کا مزاج ہم آہنگ تھا ہی نہیں۔ سب سے بڑی خرابی مرحوم میں یہ تھی کہ وہ الفاظ کو ان کے متعارف مفاہیم سے خالی سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ جو شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس سے اس کی حقیقی مراد بھی وہی ہے جو بظاہر ان الفاظ کا تقاضہ ہے۔ ظاہر ہے ان کا یہ خیال بار بار شکست سے دوچار ہوتا رہتا تھا اور ہر بار ان کے ذہن کو کچھ اور پریشان کر جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی مدت ملازمت کی پوری مدت علی گڑھ میں گذار دی اور اپنے دنیا ناشناس مزاج اور اپنی عافیت پسند طبیعت کی وجہ سے اس جزیرہ علم کے مہذب معاشرے میں بے گانہ آسا بن کر رہے، وہاں کیسے کیسے لوگ کیا کیا نہ پا گئے مگر اختر انصاری ایک چھوٹے سے دائرے ہی میں گردش کرتے رہے۔ ٹریننگ کالج کے لکچرر شپ سے آگے بڑھنا نصیب نہیں ہوا۔ اچھے دنیا داروں کا ظاہر فریب معاشرہ ایسے لوگوں کو بس از راہ مروت ایک حد خاص تک

ہی گوارہ کرتا ہے، جو اس معاشرے کے مسلمہ آداب واطوار کو اوڑھے لپیٹے نہ رہتے ہوں۔ وہ کڑھتے تھے مگر وہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ ترقی کے پیچدار زینے پر چڑھنا ان کے بس کی بات نہیں، کچھ تو ان کے مزاج کی نرگسیت اور کچھ اس احساس کے اثرات، ان دونوں نے مل کر ان کی زندگی کے ارد گرد ایک دائرہ کھینچ دیا تھا اور اپنے ذہن کی تسکین کے لیے وہ ایک کمرے میں بہت سی چیزیں سجائے ہوئے اپنی خیالی دنیا میں گھومتے رہتے تھے۔ چھڑیاں ہیں وہ بہت سی، چشمے ہیں تو متعدد، اور ایسی ہی دوسری چیزیں۔ ایسی چیزوں کی کثرت اور تیز رنگوں کی چمک احساس محرومی کا مداوا بن کر ذہن کو کچھ تسکین پہنچاتی ہوں گی۔ ان کے شروع کے قطعوں میں فضا، برسات، چاندنی، راگ اور آنسوؤں کی جھڑی کا بیان بار بار ملتا ہے۔ یہ عناصر ان کی جوانی اور ان کے اس زمانے کی جواں سال شاعری کے غالب اجزاء رہے ہیں۔ جب زندگی میں دنیا کی دوسری غیر رومانی حقیقتوں نے عمل دخل حاصل کرلیا اور ان کی شاعری سے ان اجزاء کو بڑی حد تک بے دخل کر دیا، اور اسی نسبت سے بے رنگ بھی تو پھر چھوٹی چھوٹی چیزوں کی چمک اور رنگینی شاید ان اجزاء کا بدل بن کر ان کے ذہن کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہوگی۔

بقول ڈاکٹر محبوب الٰہی ''وہ گوشہ گیر اور تنہائی پسند تھے، لیے دیئے رہتے تھے اور بے حد نفیس مزاج کے مالک تھے۔ ان کی بے داغ شخصیت نقاب اندر نقاب کی حامل ہوتے ہوئے اتنی دلکش اور حیران کن تھی کہ جس نے انہیں ایک بات دیکھ لیا وہ پھر ان کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ یوں تو دنیاوی لحاظ سے انہوں نے ناکام زندگی نہیں گذاری، زندگی کو وہ اپنے سلیقے اور اپنے خاص اہتمام کے ساتھ بسر کرتے رہے اور ان کی قدر بھی کی گئی اور انہوں نے شہرت بھی پائی۔ ان کی کتابیں نصاب میں شامل کی گئیں، اور ان کے رومانی قطعات پر ان کے نکتہ چین بھی سکوت سخن شناس کے مجرم نہیں بنے، یہ سب کچھ تھا مگر............وہ شعبہ اردو میں اپنی مستقل جگہ نہیں بنا سکے۔''

اختر انصاری کا المیہ محض یہ نہیں ہے کہ وہ علی گڑھ کے ماحول میں اپنی جگہ نہیں بنا سکے یا شعبہ اردو میں جگہ نہیں پا سکے بلکہ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے ان کی زندگی بار بار صدموں سے دوچار ہوتی رہی۔ پہلا صدمہ یہ تھا کہ والد کی موت کی وجہ سے وہ آئی اے ایس نہ بن سکے۔ پھر حالات کی ناسازگاری کے سبب وکیل نہ بن سکے۔ پھر شعبہ اردو میں مستقل لکچرر، ریڈر یا پروفیسر نہ بن سکے۔ ساہتیہ اکاڈمی کا ایوارڈ نہیں ملا، اردو ترقی پسند ادیبوں نے تو ان کو نظرانداز کیا ہی گھریلو حالات نے بھی صدموں پر صدمے پہنچائے، دوستوں میں کوئی رفیق نہ بن سکا۔ ان کا ایک نواسہ ذہنی طور پر غیر متوازن تھا۔

نتیجہ یہ کہ ان میں قنوطیت پسندی بھی پیدا ہوگئی اور انہیں وہم ہونے لگا کہ ان کی تقدیر ہی خراب ہے۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کہتے ہیں ''وہ کہتے تھے کہ ان کے اوپر ایک ایسا سایہ ہے جو ان کے ہر کام کو بگاڑ دیتا ہے یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ زندگی کے محض منطقی پہلو کو ہی دیکھتے تھے۔'' ظہیر احمد صدیقی کو ایک خط میں اختر انصاری لکھتے ہیں:۔

اب سال بھر سے وہی اپنے گھریلو مسائل کی بنا پر بالکل خانہ نشین ہو کر رہ گیا ہوں۔ اردگرد کی دنیا سے بے خبر، سماجیات کے مفکر نے کہا ہے NO MAN IS AN ISLAND INTO HIMSELF لیکن اس بدبخت کے حالات نے کچھ ایسی صورت حال سے دوچار کیا کہ اس مسلمہ صداقت کی تردید کا جیتا جاگتا اشتہار ہوں، اور جیتا جاگتا بھی کہاں اردگرد کی دنیا نے مجھے جیتے جی مردوں کی فہرست میں داخل کر دیا ہے۔''

ظہیر احمد صدیقی کہتے ہیں:۔

''ان کی اس یاسیت کا سبب وہ رویہ بھی تھا جو علی گڑھ عام طور پر اپنے محبت کرنے والوں سے برتا کرتا ہے یعنی بے نیازی اور تغافل۔''

ان کے ذہنی خلفشار اور کرب کا ایک سبب ان کا معذور نواسہ بھی تھا۔ بیٹی کا

انتقال ہوگیا تھا اور ان کے معذور لڑکے کی نگہداشت کی ذمہ داری اختر صاحب پر آپڑی تھی۔ ان کی کتاب اردو فکشن بنیادی اور تشکیلی عناصر کے سلسلے میں ایک دن مجھے ان کے یہاں گزارنا پڑا۔ اس دوران انھوں نے بہت سی باتیں بتائیں مگر اس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ انشا اللہ پھر کبھی۔

ایک خط میں وہ ظہیر احمد صدیقی کو لکھتے ہیں:۔

''پندرہ دن سے اپنے معذور نواسے کے ملازم کی عیوضی پر مامور ہوں اور کسی جہنمی سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہوں۔''

ایم حبیب خاں کا کہنا ہے:۔

''انہیں ایک ذہنی تکلف یہ تھی کہ ان کے ہمعصر نقاد اپنی تنقیدوں میں ان کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اختر انصاری اپنے آگے کسی کو گردانتے نہیں تھے ان کی یہ انا ان کو زندگی بھر اندر ہی اندر گھلاتی رہی۔ بلاشبہ وہ ذہین انسان تھے لیکن مزاج میں سختی اور تکبر ان میں ایسا پیدا ہوگیا تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اس سخت گیری نے ان کو بہت نقصان پہنچایا۔ اختر انصاری میں انا کے علاوہ کچھ اور کمزوریاں بھی تھیں وہ اپنے مخالفوں کو معاف نہیں کرتے تھے تین چار حاشیہ نشین ان کے گرد ایسے جمع رہتے جو اختر صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے اور اس سے ان کو غذا ملتی۔

اختر صاحب مشفق خواجہ سے اس بات پر خفا تھے کہ انہوں نے فکشن پر ان کا مقالہ کئی سال بعد رسالہ اردو میں اور بعد میں کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو کراچی سے چھپوایا تھا اور اس میں غلطیاں زیادہ راہ پا گئی تھیں حالانکہ یہ غلطی اس ادارے کی تھی جس نے کتاب چھاپی تھی۔''

انہوں نے اپنی نظم زمانہ میں اپنے حال کا بہترین انداز میں شکوہ نظم کیا ہے کہتے ہیں۔

جس کو مرنا ہے مرے ہم نہیں مرنے والے ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے
زہر کا گھونٹ پیا ہم نے تو بس سانس لیا دام تزویر میں قاتل نے ہمیں پھانس لیا

یہ زمانہ کھلا قاتل جو نہیں تو کیا ہے بخدا ظالم و جابل جو نہیں تو کیا ہے

اس کے جبڑوں سے تو ہر آن ٹپکتا ہے لہو کہنیوں سے بھی بالاعلان ٹپکتا ہے لہو

کند چھریوں سے ہمیں ذبح کیا ہے اس نے قطرہ قطرہ لہو اس طور پیا ہے اس نے

کتنے رستے ہوئے زخموں کو جھنجوڑا اس نے کتنی سوئی ہوئی مٹیوں کو جھنجوڑا اس نے

اس نے بخشی وہ عجب برش انفاس ہمیں لذب نیش بھی آئی نہ کبھی راس ہمیں

خاک اور خون میں غلطاں رہے اس کے ہاتھوں سرنگوں ہر گریزاں رہے اس کے ہاتھوں

یہ زمانہ کھلا قاتل جو نہیں تو کیا ہے ہم نے تقدیر الٰہی سے جو حصہ پایا

وہ اس اکال نے بے دغدغہ لوٹا کھایا ہائے کیا کیا نہ رگ جاں کو نچوڑا اس نے

بھیک میں پھیلتی بانہوں کو مروڑا اس نے تھے جو تقدیس کے رشتے سبھی توڑے اس نے

محنت غم کے پسینے بھی نہ چھوڑے اس نے یہ زمانہ کھلا قاتل جو نہیں تو کیا ہے

ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے جس کو مرنا ہے مرے ہم نہیں مرنے والے

ایم حبیب لکھتے ہیں:۔

''ہر ایک کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے ان کے دوست اور قریبی ملنے والے ان سے ملنے سے کتراتے تھے۔ کسی حد تک سادہ لوح تھے اور جلد لوگوں کی باتوں میں آجاتے تھے اور دوستوں کو اپنا مخالف بنا لیتے، سیاسی داؤ پیچ سے بالکل ناواقف تھے۔ عرض مصلحت نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی، تلون مزاجی کا دخل

طبیعت میں بہت تھا، اس لیے اپنے فیصلے بدلنے میں اور دوستوں کو دشمن بنانے میں ان کو دیر نہیں لگتی تھی۔''

رشید حسن خاں نے اختر انصاری کے کردار کا جو تجزیہ کیا ہے وہ بہت حد تک درست ہے لیکن یہ تجزیہ اختر انصاری کی ہمہ جہت شخصیت کو پوری طرح اجاگر نہیں کرتا اور محض ایک پہلو، ترقی کے معاملے میں محرومی اور اس کے اثرات، پر ہی زور دیتا ہے ۔حالانکہ اس محرومی کے کئی اسباب تھے اور ایک بڑا سبب یہ تھا کہ بہت زیادہ مطالعہ کی عادت تھی جس کی وجہ سے انسان میں جہاں بہت سی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں وہیں کئی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے شخص کی اگر کسی نے دست گیری نہ کی تو زندگی کی چوہا دوڑ میں سماج کے دوسرے ممتاز لوگوں کی طرح (جو بالعموم اس مطالعہ زدہ آدمی سے کم صلاحیت ہوتے ہیں) وہ کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اعمال پر بعض اوقات قابو نہیں رکھ سکتا۔ مثال کے طور پر اختر انصاری کا ہی ایک واقعہ پیش ہے جسے مشرف علی صدیقی نے نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

''ایم اے اردو نظم کا پرچہ تھا اور پہلے ہی سوال کے جواب میں کافی وقت صرف ہو گیا، جب گھڑی دیکھی تو ڈیڑھ گھنٹے کے قریب ختم ہو چکا تھا اور باقی وقت میں صرف دو سوال کے جواب اور تحریر کئے اور کاپی جمع کرا دی۔''

علامہ اقبال نے بحیثیت ممتحن کاپی کی جانچ کی ۔ ظاہر ہے تین جوابات میں پانچ جوابات کے نمبر نہیں مل سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے امتحان دینے والے کی بڑی تعریف کی۔ جب اس کی اطلاع اختر صاحب کو ملی تو انہوں نے کچھ فخر محسوس کیا، کچھ شرمندگی سے دامن گیر ہوئے اور اپنی بے بسی پر نادم ہو کر رہ گئے۔''

شہپر رسول لکھتے ہیں:۔

''مکمل انسان اس طرح کہ تکمیل انسانیت محروم پر فخر کر سکتی تھی نہایت انکسار پسند، خوش مزاج، سادہ طبیعت، نرم گو اور ادب کے دوسرے لوگوں سے قطعی جدا، ہر اچھی

بری سے دور، اپنے کام سے کام والے آدمی تھے۔"

(شہپر رسول اور دوسرے کم عمر لوگوں سے ان کا برتاؤ مشفقانہ تھا لیکن اپنے معاصرین اور اکابرین سے ان کا رویہ تقریباً جارحانہ تھا۔ ب۔ا)'

شہپر رسول ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں، انہوں نے اپنے دوست سے کہا:۔

"یار تم کیوں آگئے، اب تمام رات مجھے پرانی یادیں تڑپائیں گی اور میری زندگی عذاب ہو جائے گی۔ نہ معلوم کیا کیا یاد آئے گا، اس زمانے کی خوشیاں اور ان سے بڑھ کر یاد آئیں گی، اس زمانے کی محرومیاں اور جب ایسا ہوتا ہے تو میرے ذہن و دل مفلوج ہو جاتے ہیں، میری ٹانگوں کی رگیں کھینچنے لگتی ہیں اب میں کئی روز تک سو نہیں پاؤں گا۔"

رشید حسن خاں نے درست لکھا ہے کہ یوں ذہن کی بے تسکینی بڑھتی رہی اور بقدر ذوق نہیں، کا احساس کچوکے دیتا رہا۔ فانی کی یہ رباعی ان پر پوری طرح صادق آتی ہے

عالم بدلا، فضائے عالم بدلی
ہر شے بے اختیار پیہم بدلی
اک مری تقدیر کہ بدلی ہی نہیں
اک میری طبیعت کہ بہت کم بدلی

اور یہی رویہ یعنی افتادِ طبع ان کی ناکامی کا ایک بڑا سبب تھا رشید حسن خاں نے دردبھرے انداز میں سوال کیا ہے۔

"ایسے تخلیقی فنکار کو بھی کیا ہم چھوٹ نہیں دے سکتے۔"

اختر انصاری کی شعر گوئی

اور اب ان کے فن کا مطالعہ پیش خدمت۔

اختر انصاری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۸ء میں شعر گوئی سے کیا۔ ۱۹۳۲ء

میں ان کا پہلا مجموعہ کلام ''نغمۂ روح'' شائع ہوا، اس میں قطعات ،غزلیات اور نظمیں تھیں۔لب ولہجہ کی تازگی اور ندرت اسلوب کی بنا پر اس کو اردو شاعری میں نئی آواز سے تعبیر کیا گیا۔

۱۹۴۱ء میں ''آبگینے'' کے نام سے قطعات کا مجموعہ شائع ہوا، پھر ۱۹۴۳ء میں غزلیہ مجموعہ ''خوناب'' ۱۹۴۴ء میں نظمیہ مجموعہ ''خندہ سحر''، ۱۹۶۳ء میں ''ٹیڑھی زمین'' (قطعات) ۱۹۶۳ء میں ہی غزلیہ مجموعہ ''سرود و جام''۔۱۹۶۷ء میں چند نظمیں، ۱۹۶۷ء میں ہی ''درد و داغ'' (مثنوی) ۱۹۶۸ء میں ''شعلہ بجام'' (رباعیات) ۱۹۷۹ء میں ''وقت کی بانہوں میں'' (طویل نظم) اور ۱۹۸۶ء میں ''ایک قدم اور سہی'' (منتخب کلام) شائع ہوا۔

گویا ان کی شاعری کا دور ۱۹۲۸ء سے اکتوبر ۱۹۸۸ء تک محیط ہے ان ساٹھ برسوں میں اردو ادب نے اپنے سفر کے چار سنگ میل طے کئے ہیں۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک رومانی اور اصلاحی رنگ غالب رہا۔ پھر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۵ء تک ترقی پسندی کا دور رہا۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک جدیدیت کا غلغلہ رہا۔ ۱۹۷۱ء سے نئی ترقی پسندی کا دور شروع ہوا۔

اختر انصاری اس پورے ساٹھ سالہ عہد میں تازہ کار اور تازہ دم رہے۔ رومانی رنگ کا کلام ملاحظہ ہو۔

مغنیہ

اے کہ تو راگنی میں ہے مدہوش
اے کہ تو گم ہے مست تانوں میں
تھم کہ گیت اپنے بازوؤں پہ مجھے
لئے جاتا ہے آسمانوں میں

۱۹۳۳ء

رات کے وقت

کوئی جنگل میں گا رہا ہے گیت
دھیمی آواز دکھ بھرا لہجہ
دل کو گویا یہ مل گیا ہے حکم
اشک خوں بن کے آنکھ سے بہہ جا۔ ۱۹۳۳ء

۱۹۳۳ء میں اختر انصاری ۲۴ برس کے تھے، پرانے محاورے کے مطابق ''جوانی کی راتیں مرادوں کے دن'' تھے۔ کچی عمر اور ناتجربہ کاری کا زمانہ تھا۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کے سٹی ہائی اسکول میں وہ ملازم ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ایم اے کیا اور شعبہ اردو میں لکچرار ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۸ سال تھی، گویا عین عالم شباب تھا۔ کامیابی ان کے قدم چوم رہی تھی۔ وہ بحیثیت شاعر، افسانہ نگار، اور ناقد اپنا سکہ جما چکے تھے۔ ٹیچر کی حیثیت سے بھی ان کا رعب تھا۔ معاملات ٹھیک چل رہے تھے ۔ پھر اچانک ان کے مقدر کا ستارہ گردش میں آیا۔ اور اس میں ان کی شہرت اور مقبولیت کا بھی یقیناً قصور رہا ہوگا۔ وہ شعبہ اردو سے ہٹا دئے گئے ، اور ٹیچرز ٹریننگ کالج میں لکچرر بنا دئے گئے۔ اس وقت کی عمر ۴۱ سال تھی۔ تجربہ کاری اور پختہ عمری کے عہد کا آغاز تھا وہ ۲۱ سال ٹریننگ کالج میں بحیثیت لکچرر کام کرتے رہے ، اور کڑھتے رہے، ان کے جیسا شاعر، افسانہ نگار، اور ناقد لکچرر کی حیثیت سے ٹریننگ کالج میں پڑا رہا۔ یونی ورسٹی یا شعبہ اردو میں اس کا داخلہ نہیں ہو سکا۔ جب کہ ایک سے ایک نا اہل لکچرر بنتا رہا۔ ریڈر بنتا رہا۔ یہ درد محرومی گھن کی طرح اختر انصاری کو کھا گیا۔ ان میں ادب کے ارباب حل و عقد سے تنفر کا جذبہ بڑھتا رہا۔ ان جذبات کا بڑا اچھا اظہار ان کی نظم میں ہوا، کہتے ہیں:

''میں قدرتی موت نہیں مروں گا، قدرت موت تو عام لوگوں کو آتی ہے ، میں عام آدمی سے الگ ہوں، ان سے زیادہ تیز ذہین اور باصلاحیت ہوں، لیکن بدقسمت بھی ہوں، تمام کاوش اور جد و جہد کے باوجود مجھے بہت تھوڑا ملتا ہے۔ دراصل

میری زندگی جہاد ہے اور میں مجاہد ہوں، اور دنیا میرے لیے میدان جنگ ہے میں اس میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارا جاؤں گا۔ اس لیے مجھے شہادت ملنی ہے۔

میں عام لوگوں سے مختلف اور بدنصیب ہوں، موت بھی آسانی سے نہیں آئے گی، مقہور اور ذلیل آسانی سے نہیں مرتے، موت مجھے تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔

لوگ میرے دشمن ہیں، وہ مجھ پر ظلم کرتے ہیں وہ جاہل اور ظالم ہیں وہ بے دھار چھری سے ذبح کرتے ہیں، تاکہ جلد اور آسانی سے موت نہ آسکے، جو زخم مجھے لگتے ہیں ان کو بھی بھرنے نہیں دیتے، بلکہ کتوں کی طرح بھنبھوڑ کر انہیں اور تکلیف دہ بنا دیتے ہیں۔ (نظم صفحہ 88 پر ملاحظہ کیجئے)

''زمانہ'' ۱۹۸۱ء یا ۱۹۸۲ء میں لکھی گئی جب ان کی عمر ۷۲ سال تھی اور وہ ایک سال پہلے ریٹائر ہو چکے تھے، اس قدر کڑواہٹ اور نفرت سے بھرپور ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ جو شاعر ۱۹۳۳ء میں خزاں کے مہینوں میں بھی شادابی کا نظارہ کرتا تھا، بہار افروز سپنوں اور ضیائے مہر سے معمور آنکھوں کے گیت گاتا تھا اور غم کا مذاق اڑاتا تھا اس لیے کہ اس نے اپنے محبوب کا شباب دیکھا تھا اور اسی لیے نشہ خواب میں مدہوش تھا، پھولوں کی رونق، کھلے ہوئے تارے، ضیا کے فوارے اور حسین نظارے اس کے لیے جنت نگاہ تھے اور جسے گیت اپنے بازوؤں میں تھام کر آسمانوں میں اڑتے پھرتے تھے۔ ۱۹۸۱ء میں اس قدر بددل اور بیزار ہو جاتا ہے کہ اس کے الفاظ میں کڑواہٹ اور زہر کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

دراصل اختر انصاری اپنی زندگی کی سہ پہر میں محرومیوں اور ناکامیوں سے اس قدر دوچار ہو جائے کہ ابتدائے عمر کی محرومیوں کے زخم جو دور شباب میں دب گئے تھے ایک بار پھر تازہ ہو گئے، اور تا عمر رستے رہے۔

زندگی کی دوپہر کے زخم اس قدر کاری ہوتے ہیں کہ ان سے انسان کا جانبر ہونا مشکل ہوتا ہے اور بالعموم تعلیم یافتہ ذہین لوگ ہی زندگی کی دوپہر میں کم ظرف حاسدوں کا شکار بنتے ہیں۔

اختر انصاری کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ آخر عمر میں انہوں نے نئے رسائل اور کتب کا مطالعہ تقریباً بند کر دیا تھا، حالانکہ زندگی بھر وہ نئے ادب اور رسائل کے رسیا رہے۔ لیکن آخر کار وہ بیزار تر ہوتے چلے گئے۔ مجھے ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ اب تو میں پرچوں کا ریپر کھول کر بھی نہیں دیکھتا کہ کیا ہے۔ البتہ آپ کالم نگار نمبر مجھے ضرور بھیج دیں۔

- اختر انصاری نے غزلیں بھی کہی ہیں نظمیں، رباعیات، اور قطعات بھی، لیکن قطعہ نگار کی حیثیت سے ان کی پہچان نمایاں ہے۔ غزل گوئی یا نظم گوئی میں انہیں خاص شہرت نہیں ملی، حالانکہ ان کا ایک شعر زبان زد عام ہے اور یہ مقبولیت محض چند شعروں کا مقدر ہے۔ وہ شعر یہ ہے

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اختر انصاری کی غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو
مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

شباب درد بھری زندگی کی صبح سہی
پیوں شراب یہاں تک کہ شام ہو جائے

دل کا خوں آنکھوں میں کھنچ آیا چلو اچھا ہوا
میری آنکھوں کو برا احوال کہنا آ گیا

سوال ہے غم ہستی کے بیت جانے کا
یہ زندگی تو بہر حال بیت جاتی ہے

آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی اپنی خوشی
اب یہ حالت ہے کہ ہنستے ہوئے بھی ڈرتے ہیں

قطعات نگاری میں ان کا نام سرفہرست ہے:۔
چند نمونے ملاحظہ ہوں

اندھیری رات، خموشی، سکوت کا عالم
بھری ہے قہر کی مستی ہوا کے جھونکوں میں
سکوت بن کے فضاؤں پہ چھا گئی ہے گھٹا
برس رہی ہیں خدا جانے کیوں مری آنکھیں

☆☆☆

اس رو پہلی شراب نوریں سے
کاش میں جام شعر بھر سکتا
اے شب مہ کے منتشر جلوو!
کاش میں تم کو نظم کر سکتا

☆☆☆

اس طرح قلب میں پنہاں ہے تصور تیرا
جس طرح چاند گھٹاؤں مُیں چھپا ہوتا ہے
سینہ معمور ہے یوں تیری حسیں یادوں سے
آسماں جیسے ستاروں سے بھرا ہوتا ہے

اختر انصاری نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن اردو کے دوسرے ہم عصر شعرا کی طرح ان کی نظموں میں بھی نظمیت کم اور غزلیت زیادہ ہے۔ موضوعات کی فکر انگیزی اور تنوع بھی نہیں۔ لب ولہجہ معتدل اور خوش گوار ہے۔ غزلوں اور قطعات میں نیا آہنگ اور نیا رویہ ہے۔ مروجہ اسالیب بیان اور روایتی رموز و علائم سے اجتناب بلکہ انحراف کا رویہ ہے جو آج معنی خیز اور دوررس اثرات کا نظر نہیں آتا۔ مگر جب یہ اردو ادب کے ایوان میں بہار آفریں ہوا تھا اس وقت ہر طرح سے انقلاب آفریں اور نیا تھا۔ اس نے اردو شعر گوئی کی پرانی روایت کو توڑ کر نئی روایت کی بنا رکھنے میں اہم کردار

ادا کیا۔ خاص طور پر قطعات کی صنف نے نئے وزن و وقار کے ساتھ اعتبار اور مقبولیت حاصل کی۔

انھوں نے ترقی پسندی کے دور شباب میں بھی چیخ و پکار اور نعرہ بازی سے حتی الامکان اجتناب کیا۔ انھوں نے ہمیشہ موضوع اور نفس مضمون کے ساتھ اظہار بیان اور اظہار پیش کش کے جمالیاتی تقاضوں کو مدنظر رکھا۔ برہنہ گوئی یا مقصد کو پیش کش پر ترجیح دینے سے انھوں نے ہمیشہ احتراز کیا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی راہ الگ نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں یگانہ کی طرح بت شکنی کو شعار نہیں بنایا، البتہ بت گری کی کوشش کی۔

اختر انصاری کی شاعری، فن اور اسلوب پر کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ مرزا خلیل بیگ نے ان کی طویل نظم کا بہت عمدہ اسلوبیاتی تجزیہ کیا ہے۔ وحید اختر نے بھی ان کی نظم گوئی کی زبردست اور درست داد دی ہے لیکن ایک اہم کمی جوان کے اشعار (نظم ہوں یا قطعات یا رباعیات یا غزل) میں ہے وہ یہ کہ یہ دل کے تاروں کو چھیڑنے کی بجائے دماغ کے تاروں کو چھیڑتے ہیں اور شاعری چاہے کتنی ہی فکر انگیز ہو جب دل کے تار نہیں چھیڑتی کامیاب اور جاوداں نہیں ہوتی۔

اور اس کے لیے ضروری ہے کہ شعر چاہے فنی طور پر خام ہوں مگر ان میں سوز و گداز، مستی، درد، اضطراب، اور لطافت ہو، اردو زبان میں ہزاروں اچھے شعراء ہیں۔ مگر میر، غالب، اقبال اور فیض ہی سب سے نمایاں اور چمکتے نظر آتے ہیں۔ اس کے دیگر اسباب میں سب سے اہم سبب یہی ہے کہ میر کے یہاں بے خودی ہے، جو عرفان غم کا نتیجہ ہے۔ غالب کے یہاں عرفان حیات کے نتیجے میں زندگی کی ہمہ رنگی نظر آتی ہے۔ اقبال کے یہاں سوز و گداز، نرمی، اور گھلاوٹ ہے۔ لہجے کی بلند آہنگی اور فکری ثقالت ہے۔ مگر مستی یا جذبہ مستانہ سب پر حاوی ہے۔

اور یہی کمی اختر انصاری کی شاعری کو مجروح کرنے کا سبب بنی ہے۔ البتہ جہاں کہیں نفرت، کڑواہٹ، غصہ، بددلی، بیزاری اور کاوش کی بجائے درد یا غم کی

لے تیز ہوگئی ہے وہاں اختر انصاری بہت کامیاب ہیں۔

اختر انصاری کی شاعری اردو کے چند منتخب شعرا کی کاوش کی ہم رتبہ ہے اور یاس یگانہ کی شاعری سے مماثلت رکھنے کے باوجود منفرد ہے، اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بہت احتیاط اور کاوش سے کام لیتے ہیں، وہ خود کہتے ہیں۔

''میں نے اس نظم کے آغاز کے وقت ہی فیصلہ کیا تھا کہ میں اس تخلیق کو اپنی پچھلی تمام کاوشوں سے اس طور پر ممتاز و مختلف بناؤں گا کہ عملی تخلیق کی جن بے اعتدالیوں یا بے سود پسندیوں سے مجھے عمر بھر کوئی فائدہ نہ پہنچا ان کو اس نظم سے دور رکھوں گا۔ مثلاً ضرورت سے زیادہ منجھائی CHISSELING توازن، تناسب اور تشاکل SYMMETRY کے باب میں انتہائی غلو، وفور جذبات کے اظہار میں ایک کیفیت انفجار پیدا کرنے کی کوشش RESTRRINT کا فقدان وغیرہ۔ چنانچہ میں نے اس نظم میں اپنی زندگی بھر کی روش کے علی الرغم کسی قدر کھردراپن یا ڈھیلا ڈھالا پن بلکہ ایک اکھڑا اکھڑا سا انداز دانستہ طور پر داخل کرنے کی کوشش اور بہر حال اپنی مخصوص تراش وخراش پیدا کرنے کے سلسلے میں کوئی محنت نہیں کی اور پوری توجہ مواد کی پرتوں کو بتدریج وا کرنے پر صرف کی۔''

ابوذر عثمانی کے نام ایک خط سے اقتباس

مطبوعہ، اختر انصاری نمبر، اردو ادب دہلی

ذیل کے سطور سے ان کے منفرد روش شعر گوئی کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

''اردو غزل کا خاتمہ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ء کے درمیانی دور کا حادثہ ہے۔ گزشتہ تقریباً تیس سال میں جو غزل لکھی گئی ہے وہ صرف فارم کے بعض پہلوؤں کی پابندی کے اعتبار سے غزل کہی جاسکتی ہے، ورنہ دراصل وہ غزل نہیں ہے، اس کو زیادہ سے زیادہ شاعری کی کوئی نئی قسم کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ بہتر ہوتا کہ اس کو غزل کی بجائے کوئی دوسرا نام دیا جاتا۔ جیسے مثلاً اس سے بھی دس قدم آگے کی لغویتوں کو ''نثری شاعری'' اور ''آزاد غزل'' کا نام دیا گیا ہے۔ میں جدیدیت والی غزل کو کلاسیکی غزل سے

یکسر مختلف چیز اس لیے سمجھتا ہوں کہ بیان و اظہار کے ذرائع (رموز و علائم) تمثیلی اور استعاراتی اسالیب جو دو ہزار سال کی فارسی اور اردو غزل کا ورثہ ہیں، ان سے ان کا رشتہ بالکل رشتہ کٹ چکا ہے۔ اور اس کو محض شاعری کے معیار سے گرا ہوا بھی اس لیے خیال کرتا ہوں کہ یہ وہ شاعری ہے جو شاعری کی سب سے اہم اور بنیادی شرط کو پورا نہیں کرتی، یعنی اس کی اساس تخیلی و جمالیاتی تجربات پر نہیں ہے بلکہ تجربات محض پر ہے۔ اور تجربات بھی وہ نہایت ادنی پیش پا افتادہ اور معمولی تجربات ہیں۔"

ابوذر عثمانی کے نام خط

مطبوعہ اختر انصاری نمبر، اردو ادب دہلی

اختر انصاری کی افسانہ نگاری

اختر انصاری کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ پہلا افسانہ "بہ بین تفاوت رہ" تھا جو پریم چند کے افسانے کفن سے ایک سال پہلے شائع ہوا۔ اس دور میں رومانیت کا دور دورہ تھا۔ نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش کی رومانیت کے ساتھ ساتھ اصلاح پسندوں کی تحریک بھی کافی فعال تھی۔ خود پریم چند جو بعد میں اصلاحی اور مقصدی ادب کے مبلغ بنے۔ رومانیت اور داستانیت کی خیالی طوطا مینا والے انداز سے متاثر تھے۔ سوز وطن کی کہانیاں داستانی رنگ کی حامل ہیں۔

دراصل رومانی کارناموں میں جوش و خروش، جذبات، ہیجان تخیل، فکر و تصور کی بے اعتدالی اور ان دیکھی دنیا اور ان جانی سرزمینوں کی جانب میلان طبع پایا جاتا ہے وہ بھی داستانی اثرات کا نتیجہ ہے۔

اردو میں بالعموم رومان کو عشق و محبت کا مترادف کہا جاتا ہے۔ حالانکہ رومان کا مطلب محض عشق و محبت نہیں ہے بلکہ اس کا اصطلاحی مطلب ہے تخیل کی اڑان اور حقیقی دنیا سے احتراز، خود عشق و محبت کے اسیر بھی حقیقی دنیا کی بجائے تخیلی دنیاؤں میں اڑتے ہیں۔ اسی لیے انھیں رومان پسند سمجھا جاتا ہے، اور کاروبار عشق کو رومانی معاملات کہا جاتا ہے۔ میں نے جہاں بھی رومان کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے

میری مراد تخیلی اڑان ہی ہے۔

رومان پسند اور اصلاح پسند افسانہ نگاروں کے پہلو بہ پہلو نیم رومانی اصلاحی افسانوی دھارے بھی چل رہے تھے۔ اس طرح کے افسانوں میں شدید اصلاحی جوش مفقود ہے اور محض جذباتیت یا خیال آرائی بھی نہیں ملتی ہے۔

اختر انصاری کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۵ء تک کے دور میں افسانہ نگاری کے متعدد متوازی دھاروں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ گویا اردو افسانوں کے بہتے ہوئے دریا کی مختلف شاخیں ہیں، ان میں پہلا دھارا تو مترجمین کی کارگزاری سے عبارت ہے۔ جنہوں نے اس دور میں مغرب کے شاہکاروں کو اردو میں منتقل کر کے اردو افسانے کی تشکیل کے باب میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ دوسرا دھارا عبارت ہے اس دور کی جمالیاتی نثر نگاروں کی تخلیقات سے جن میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو آسانی کے ساتھ افسانے کے ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس دور کے مزاج نگاروں کے بعض مزاحیہ مضامین بھی ہمیں افسانے کی شکل میں ملتے ہیں۔ اور ان کو افسانہ نگاری کا تیسرا دھارا خیال کیا جا سکتا ہے۔ چوتھا دھارا جو شاید سب سے اہم ہے وہ پریم چند اور ان کے ہم خیال یا ہم رنگ لکھنے والوں کے اصلاحی افسانے ہیں اور اس کے بعد آخری گروہ ہے جو اصلاحی اور رومانی اوصاف کی خصوصیات سے عبارت ہے۔ یہ افسانوی ادب کا پانچواں دھارا ہے۔

اختر انصاری کے ادب میں یہ رنگ کسی نہ کسی طور پر اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ لیکن اختر انصاری نے مروجہ روش سے انحراف کی شعوری کوششیں کیں۔ انھوں نے ''تاثراتی افسانوں'' کا آغاز کیا اور بے پلاٹ کی کہانیاں لکھیں۔ اس لیے اس زمانے میں اختر انصاری کی افسانہ نگاری کو اردو افسانے کا ایک نیا اسکول قرار دیا گیا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اور جیسا کہ ہر تحریک میں ہوتا ہے ابتداً افراط و تفریط کا سماں تھا اور روایت سے انحراف، نعرہ بازی اور پروپیگنڈہ پر زیادہ زور تھا۔ انگارے کے افسانے اسی دور کی یادگار ہیں، اور یہ افسانے ترقی پسند تحریک

کے بانیوں نے لکھے تھے۔اس لیے نعرہ انقلاب اور سماجی تبدیلی وغیرہ پر بیجا اصرار بھی کیا جاتا تھا۔فن کے اعلیٰ معیار اور جمالیاتی اصولوں کونظرانداز بھی کیا جاتا تھا لیکن اختر انصاری کی افسانہ نگاری میں موضوع اور پیش کش کا کلاسیکی ،رومانی اور ترقی پسندانہ امتزاج ملتا ہے۔متوازن اور صحتمند امتزاج ،وقار عظیم کا یہ کہنا درست ہے کہ:۔

''اختر انصاری ہی اردو کے ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند ہوکر بھی وہ نئے ادب اوراس کی نئی طرز کی غلط راہوں سے بہت دور ہیں۔رند ہوکر بھی رندی کی مدہوشیوں سے بچنے کا دعویٰ اختر انصاری کے علاوہ اردو کا کوئی دوسرا افسانہ نگار نہیں کرسکتا۔''

اختر انصاری نے پہلی بار اردو میں بے پلاٹ کی کہانیاں لکھیں۔اس کے علاوہ انھوں نے سوانحی طرز کے افسانے بھی لکھے۔خود اختر انصاری اپنے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''یہ افسانہ ہجر و وصل اور بوس و کنار کی غلیظ داستانیں نہیں۔''

''یہ افسانے ادب لطیف کی آڑ لے کر انفرادی جذبات کی کیچڑ نہیں اچھالتے۔''

''یہ افسانے پیٹ بھروں کی دماغی عیاشی کے لیے نہیں لکھے گئے۔''

''یہ افسانے اکثر ادبی شاہکاروں کی طرح افیم کے انٹے نہیں ہیں۔''

''یہ افسانے ہماری اجتماعی زندگی اوراس کے ناسوروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔'' (اندھی دنیا)

''گرمیوں کی ایک دوپہر'' ایک پڑھے لکھے غریب اور بے روزگار نوجوان کی کہانی ہے جسے ابھی تانگے کی سواری بھی میسر نہیں۔

''اندھی دنیا'' کا حمید اس لیے اندھا ہوجاتا ہے کہ اسے پڑھنے کا بے حد شوق ہے لیکن مفلسی کی وجہ سے چراغ میں تیل نہیں رہتا اور وہ سڑک پر لیمپ کے نیچے یا چاندنی میں پڑھتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی اختر انصاری کو لکھتے ہیں:۔

''بھول'' میں بہت جگہ مجھے اپنی زندگی کی تفسیر نظر آئی، میرے خیال میں جو شخص بھی اس افسانے کو آپ کا خود نوشت سوانحی افسانہ سمجھ کر پڑھے گا اس کے دل میں ٹیس اٹھے گی۔''

بھول کا مرکزی کردار ایک غریب باپ کا بیٹا ہے، وہ اپنی غربت میں مطمئن ہے اس لیے کہ اسے غربت نے زندگی کا ایک فلسفہ دیا ہے۔ اس میں خود کلامی کی تکنک استعمال کی گئی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شعور کی رو کی تکنک بھی استعمال کی گئی ہے۔

''ایسا کیوں کیا'' سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ یہ ایک غریب مگر ذہین طالب علم کی کہانی ہے، جسے ہیڈ ماسٹر اپنی مہربانیوں سے ہوسٹل کا ایک ایسا کمرہ دیدیتے ہیں جو مرطوب ہونے کی وجہ سے خالی پڑا رہتا ہے۔ اسے بچا کھچا کھانا دیا جاتا ہے ۔ایک دن محض ایک معمولی سی بات پر اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے اور وہ اسکول چھوڑ کر چلا جاتا ہے، وہ کہتا ہے۔

''میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ میں نے ایسا کیوں کیا'۔

''دریا کی سیر'' ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا اور اپنے معاصر افسانوں سے بالکل مختلف نوعیت کا حامل ہے۔

''لو ایک قصہ سنو'' ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا۔ اس کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:۔

''جس افسانے نے ان کی انفرادیت کو خاص طور پر متعین کیا ہے وہ ان کا طویل مختصر افسانہ ''لو ایک قصہ سنو'' ہے۔ یہ اردو میں اپنے طرز کی واحد کہانی ہے جہاں ایک قصے سے سیکڑوں قصے نکل آتے ہیں اور پھر سب مل کر ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔''

افسانہ ''مذاق'' کے بارے میں صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:۔

''اس افسانے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ٹریجڈی ہونے کے باوجود اس کی فضا پر ایک دل افروز اور نشاط انگیز کیف آغاز سے انجام تک چھایا رہتا ہے۔''

''زبیدہ'' منظر اور پس منظر کی کہانی ہے تو ''نازو'' نفسیاتی کہانی ہے۔

اختر انصاری نے تقریباً اٹھاون افسانے لکھے ہیں اور ہر افسانے میں ''ایک نئی بات'' پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر سے پہلے اختر انصاری نے ہی افسانہ نگاری میں سب سے زیادہ تجربے کئے ہیں۔

اختر انصاری کی افسانہ نگاری کے تذکرے کے بغیر اردو افسانہ نگاری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اردو کے ارباب حل وعقد کی بے حسی اور سیاست نے اس اہم اور ہمہ جہت ادبی شخصیت کو زندگی میں ہی تقریباً نظر انداز کر کے اردو کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

اختر انصاری کی انشائیہ نگاری

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اختر انصاری کے انشائیوں کے مجموعہ ''یادوں کے چراغ'' (جو کتابی شکل میں منظر عام پر ابھی نہیں آیا) پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مصنف نے اس کا التزام کیا ہے کہ بعض عام اور اہم باتوں کی بجائے چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کے پس منظر میں ایسی تصویر ابھاری جائے جن کا مشاہدہ نہ کرنے سے شخصیت کے تار و پود کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس ڈائری میں افسانہ اور لطیف انشائیہ کی ملی جلی کیفیت ہے۔''

اختر انصاری کی ڈرامہ نگاری

اختر انصاری نے ''فردوس جہاں'' کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ ڈرامہ کے بارے میں اختر انصاری کی رائے تھی کہ:۔

''ڈرامہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے لیکن اس ترجمانی کا انداز ناول اور افسانے کے انداز بیان سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ یہاں عملی اداکاری بیانیہ انداز کی جگہ لے

لیتی ہے چنانچہ حرکت با عمل ڈرامے کی تکنک کا اساسی عنصر ہے۔"

"فردوس جہاں" آل انڈیا ریڈیو سے نشر بھی ہو چکا ہے، اسے طویل یک بابی ڈرامہ کہہ سکتے ہیں۔ رومانی معاشرتی ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اختر انصاری اس طرف توجہ دیتے تو اردو میں کچھ اچھے ڈراموں کا اضافہ ہوتا۔

اختر انصاری کی تنقید نگاری

اختر انصاری کا سب سے پہلا تنقیدی مقالہ "افادی ادب" کتابی صورت میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ ایک ادبی ڈائری ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ لیکن اس کی تحریریں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء کے چار برسوں کو محیط ہیں۔ "حالی اور نیا تنقیدی شعور" بھی طویل مقالہ ہے۔ جو کتابی صورت میں ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ پھر تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو سلسلۂ مضامین پر مشتمل تھا، ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا، اور جس کا عنوان تھا "مطالعہ وتنقید" ۱۹۷۵ء میں "غزل کی سرگزشت" اور ۱۹۷۹ء میں "غزل اور غزل کی تعلیم"، ۱۹۸۴ء اور پھر ۱۹۸۸ء میں "اردو فکشن بنیادی اور تشکیلی عناصر" شائع ہوا۔

وہ افادی ادب کا نیا ایڈیشن ترمیم واضافے کے بعد "ادب اور اجتماعی زندگی" کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ ادب زندگی اور زمانہ کے عنوان سے ان مضامین کا مجموعہ شائع ہو، جو ابھی تک کسی کتاب میں شامل نہیں ہوا۔

اختر انصاری کا پہلا مقالہ جو متعدد بار شائع ہوا، اس دور کی یادگار ہے، جب ترقی پسند تحریک افراط وتفریط کا شکار تھی۔ یہ اس تحریک کے شباب کا زمانہ تھا اور کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس تحریک کے بانیوں یا مروجہ تنقیدی آراء اور ادبی روش سے احتراز کر سکے۔ جید ادیبوں مثلاً اثر لکھنوی، اور رشید احمد صدیقی کے بجا اعتراضات کی بھی ترقی پسندوں نے دھجیاں اڑا دیں۔ ایسے زمانے میں اختر انصاری نے ادبی کج روی کی طرف بھرپور اشارے کیے، جب محض "افادیت" اور مقصدیت پر زور تھا، جب لوگ سوچنے اور غور کرنے کی زحمت کے بغیر ہی حسن اور ادب کا معیار اور اقدار تبدیل

کرنے کی باتیں کرر ہے تھے۔ اور ایک نئی طرح کی کٹھ ملائیت کا فروغ ہور ہا تھا۔ اختر انصاری نے اس طرح کی باتیں کیں کہ جن پر ۱۹۵۰ء کے بعد جدیدیوں نے زور دیا اور ان باتوں کو اپنا کارنامہ سمجھ کر اچھالتے پھرے۔ اختر انصاری نے ۱۹۴۱ء میں لکھا۔

۱۔ ہم افادی اور مقصدی ادب کے علمبردار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی صرف عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔

انہوں نے لکھا۔

۲۔ ہمارا نظریہ ادب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہماری ذاتی اپج کا نتیجہ یا ذاتی تحقیقات کا ثمرہ ہو اور جس سے دنیا اب تک ناواقف رہی ہو۔ ہر ملک اور ہر زمانے کے ادیب اور شاعر اس نظریے کے علم بردار رہے ہیں اور اس کو مشعل راہ بنا کر ادب کے غیر فانی شاہکار تصنیف کرتے رہے ہیں۔ بہت سے اہل قلم ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے کبھی اس نظریئے کو ایک واضح اصول کی حیثیت سے اپنے سامنے نہیں رکھا لیکن پھر بھی ان کی ادبی تخلیقات اس نظریے کی عملی تفسیر معلوم ہوتی ہیں۔''

افادی ادب میں اختر انصاری نے بڑے مدلل، منطقی اور معقول انداز میں ''ادب برائے ادب'' کے مبلغوں کو برا بھلا کہا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ادب شاعری اور دیگر فنون لطیفہ بھی صاحب اقتدار طبقوں کی زرخرید کنیزیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ادب برائے فن یا ادب برائے ادب کے نظریئے کے حامی کہتے ہیں کہ:

۳۔ ادب کو کسی مقصد کے تابع کرنا سراسر غلط ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ادب خالص جمالیاتی چیز ہونے کی بجائے محض اخلاقی وعظ یا سماجی سدھار یا سیاسی

پروپیگنڈہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے ادیب کو آزاد چھوڑ دو، اس پر پابندیاں عاید مت کرو، اس کی ذہانت کو سماج اور سیاست کی زنجیروں میں نہ جکڑو، اس کے تخیل کے راستے میں معیشت اور معاشرت کے روڑے نہ اٹکاؤ، اس کی روحانیت کو اپنی مادی اغراض کا غلام نہ بناؤ۔"

ان کا کہنا تھا۔

۴۔ اردو زبان کا حدوث ونشو ونما جس زمانے میں ہوا وہ زمانہ تاریخ ہندوستان کے نہایت پر آشوب ادوار میں شمار ہوتا ہے۔ قومی زندگی کی شیرازہ بکھر چکا تھا ،اجتماعی روح کمزور ہو چکی تھی، ہر طرف انفرادیت کا بول بالا تھا اور خود پرستی وخود غرضی کا دور دورہ تھا۔

چونکہ اردو ادبا کے پیش نظر کوئی اجتماعی مقصد نہیں تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کا ادب سوسائٹی کے سقیم اور مذموم رجحانات کا شکار ہو گیا۔

ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس دور کے ادبا اہل فکر اور اہل قلم بیدار مغز انسانوں کی طرح اپنے زمانے کے سیاسی، معاشی اور تمدنی حالات کا بغور مطالعہ کرتے ......وہ ایک مخصوص نقطہ نظر کے مالک ہوتے۔ وہ آزادی، انصاف، انسانیت، عمل اور نہفت کے نقیب بن کر لوگوں میں ایک نئے نظام حیات کی امنگ اور ایک نئے تاریخی دور کی آرزو پیدا کرتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا، اس لیے کہ اس زمانے کے ادیب ادب برائے زندگی کے قائل نہ تھے۔ وہ خالص جمالیاتی، رومانی اور غیر مقصدی ادب کے علم بردار تھے اور شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر ادب برائے ادب کے نظریے کو صحیح نظریہ تسلیم کرتے تھے۔

وہ لکھتے ہیں:۔

۵۔ جن شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زندگی میں عالم گیر مقبولیت حاصل کی، اور مرنے کے بعد بقائے دوام کا تاج پہنا وہ ایثار پسند، اور اخلاص پیشہ ارباب فکر ونظر تھے۔ جو سارے جہاں کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے۔ انسانیت کی فلاح

و بہبود جن کا نصب العین تھا جنہوں نے آپ بیتی کا راگ الاپنے کی بجائے جگ بیتی کے نغمے گائے اور اپنی خودی کو عالم انسانیت کی زندگی میں تحلیل کر دیا۔

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

۶۔　　کیا میر کے تغزل میں اٹھارہویں صدی کے سیاسی مزاج اور اجتماعی انتشار کا عکس نہیں پایا جاتا؟ میر درد کے متصوفانہ کلام میں جو فرار پسند ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے کیا وہ اس دور کی سماجی اور اقتصادی بدحالی کا نتیجہ نہیں؟ کیا غالب کا حزن اسلامی تمدن و سیاست کی مکمل شکست کا پرتو نہ تھا؟

وہ لکھتے ہیں:۔

۷۔ادب کا مقصد ہے سماجی زندگی کو متاثر کرنا۔

۸۔طبقاتی سماج میں کسی ادیب کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ غیر جانبدار رہے اسے کسی نہ کسی طبقے کی حمایت کرنی پڑتی ہے۔۔

۹۔ترقی پسند کی صفت اصلاحی ادب کے لیے بھی استعمال کی جاسکتی ہے اور انقلابی ادب کے لیے بھی۔ اور یہاں اس امر کی وضاحت خود بخود ہو جاتی ہے کہ انقلابی ادب ہمیشہ ترقی پسند ہوتا ہے مگر ترقی پسند ادب ہمیشہ انقلابی نہیں ہوتا۔

وہ لکھتے ہیں:۔

۱۰۔　　بیشتر ترقی پسند ادیب محض اصلاحی ادب پیش کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کے متعدد اور متنوع پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن وہ اجتماعی زندگی کے مسائل کو عوام کے انقلابی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ متوسط طبقے کی اصلاحی، مفاہمتی اور جذباتی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یوں وہ موجودہ نظام کی برائیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھی گویا ان ارتجاعی قوتوں کے ساتھ دیتے ہیں جو اس نظام کی بنیادوں کو جوں کا توں رکھنے کے حامی ہیں کیا یہ ادیب سے بے جا مطالبہ نہیں ہے۔؟ کیا انقلابی مصنف کے لیے انقلابی تحریک کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کرنا قطعی طور پر لازمی ہے؟ کیا اس کے لیے یہ کافی نہ ہوگا کہ

وہ اس تحریک کے ساتھ ذہنی واخلاقی طور پر پوری طرح ہم آہنگ ہو۔؟ کیا وہ اپنی جگہ بیٹھ کر ہی تحریک کے لیے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔، کیا وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر اپنی فن کی تربیت جیسی ہونی چاہئے کرسکتا ہے۔؟ اور کیا تجربے کی کمی تخیل، تصور، احساس، مشاہدے اور مطالعے سے پوری نہیں ہوسکتی۔؟

(ایک ادبی ڈائری)

۱۱۔ ''حسن اور مزدوری'' کا شاعر سرمایہ دارانہ استحصال پر نظر نہیں رکھتا، جس جذباتی تحریک کے ماتحت وہ شعر کہہ رہا ہے اس میں یہ احساس شامل نہیں ہے کہ اس عورت کو اس کی محنت کی پوری اجرت نہیں ملے گی۔ وہ صرف ایک حسین عورت کو دھوپ میں محنت کرتے دیکھ کر کڑھتا ہے، اس کا نقطہ نظر خالص جذباتی ہے، شاعر کے نزدیک عورت کی جگہ شبستان طرب ہے۔ یہ کہاں کی ترقی پسندی ہے۔؟ (ایک ادبی ڈائری)

۱۲۔ دراصل نہایت رجعت پسند ہیں ہمارے وہ ترقی پسند شاعر جو عمومی حیثیت سے جدید تہذیب پر معترض ہوتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے اس میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ (ایک ادبی ڈائری)

۱۳۔ (فیض احمد فیض) پر کچھ لکھنا تضیع اوقات ہے۔

۱۴۔ جوش کے ساتھ فراق کا نام لینا ایسا ہے جیسے پہاڑ کے مقابلے میں کسی چوہیا کا ذکر کیا جائے۔ فراق خرافات نگار شاعر ہے۔

اختر انصاری سے مجھے ایک بار ہی ملنے کا موقع ملا مگر ان سے خط وکتابت کا سلسلہ رہا۔ انھوں نے اپنے بعض خطوط میں بہت ادبی اور ذاتی مسائل اور معاملات پر روشنی ڈالے ہیں۔ انشاء اللہ ان خطوط کی روشنی میں پھر کبھی اختر انصاری کی باتیں ہونگی۔ ☆☆☆

اپ بھرنش اور اردو

اپ بھرنش تمام جدید ہندوستانی زبانوں کا مشترکہ ورثہ ہے اسی لیے بجاطور پر تمام جدید ہندوستانی زبانوں کے مورخ اپ بھرنش کو ان زبانوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اپ بھرنش کا دور آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی پر محیط ہے۔

جدید ہندوستانی زبانوں میں (۱) آسامی (اسمیہ)، (۲) اڑیا، (۳) گجراتی، (۴) بنگلہ، (۵) مراٹھی، (۶) سندھی، (۷) پنجابی، (۸) اردو، (۹) ہندی، (۱۰) راجستھانی، ہریانوی، برج، بھوج پوری شامل ہیں۔

اپ بھرنش کے بارے میں مورخین کا کہنا ہے کہ مقامی زبانوں سے آریاؤں کی زبان کا تال میل ہوا، جس سے ویدک بھاشا ظہور میں آئی اور ویدک بھاشا تین حصوں میں بٹ گئی۔ (۱) ادکیہ پنجاب کی زبان تھی۔ (۲) مدھیہ پردیشی برج اور دہلی وغیرہ کی زبان تھی۔ (۳) بہار اور بنگال کی زبان پراچیہ کہلائی۔ اسی عہد میں ویدک بھاشا کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے صرفی ونحوی قواعد بنائے گئے اور زبان کو صاف ستھرا کر کے اسے سنسکرت (صاف ستھرا) نام دیا گیا۔ اور یہ زبان برہمنوں کی میراث بن گئی۔

عوام تعلیم یافتہ نہیں تھے لہذا سنسکرت پر ان کا حق نہ تھا وہ ہمیشہ کی طرح مقامی بولیاں بولتے رہے۔ لسانی مورخین انہیں پراکرت کا نام دیتے ہیں۔ پراکرت کی

پشاچی، (۲) شورسینی، (۳) مہاراشٹری، (۴) ماگدھی اور اودھ ماگدھی۔ ان پراکرتوں کے بھی قواعد اور اصول تھے، ماہرین لسانیات نے انہیں اپ بھرنش کا نام دیا ہے۔ اپ بھرنش کی پانچ قسمیں تھیں جو علاقائی نسبت سے مشہور ہوئیں۔

یہ اپ بھرنش آٹھویں صدی سے بارھویں صدی پر محیط ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کا ہندوستان میں ورود ہوتا ہے اور تیرھویں صدی تک ان کی حکومت ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں پر قائم ہو جاتی ہے۔

اپ بھرنش کے ۸۴ مصنفین کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان کا کلام ۱۹۰۷ء میں پنڈت ہر پرشاد شاستری نے نیپال میں ڈھونڈ نکالا تھا۔ یہ کلام بدھ سدھیوں کا ہے اس مجموعے کا نام ''چرچا چرجانی شم'' ہے مگر یہ کتاب بدھ گان دوہا کے نام سے معروف ہے اس میں پدوں کے علاوہ مختصر نظمیں بھی ہیں یہ کتاب اصل مسودہ کے ساتھ ۱۹۱۷ء میں بنگالی رسم الخط میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔

اس کتاب کا باضابطہ تعارف جناب شیر علی کاظمی نے اردو دنیا سے کرایا، اور اسے پراچین اردو کا نام دیا۔

• چرچا روزمرہ کے گیتوں کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں اسے بدھ گویتے مراد لیے جاتے ہیں۔ مولانا داؤد نے چنداین میں کہا ہے۔

''نیہہ چارجا گاؤئی چھورئی''

شبیر علی کاظمی نے بدگان دوہا کے سنیتا لیس پدوں کا اردو متن، لفظی ترجمہ، مشترکہ عناصر اور توضیحات وغیرہ کے علاوہ ایک مفید تعارفی مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے ''پراچین اردو'' کے نام سے ۱۹۸۲ء میں کراچی سے شائع کر دیا ہے۔

بدھ گان دوہا اگرچہ بنگالی رسم الخط میں شائع ہوئی تھی مگر سدھیوں کے یہ گان یا دوہے ملک بھر میں علاقائی تبدیلی کے ساتھ دستیاب ہیں اور ان دوہوں کو اسمیا، گجراتی، اڑیا، بنگلہ، مراٹھی، سندھی، پنجابی اور ہندی کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔

جدید ہندوستانی زبانوں کے مورخین نے اپنی اپنی زبان کے ارتقا پر روشنی

ڈالتے ہوئے اپ بھرنش کو اپنے لسانی سفر کی ایک منزل قرار دیا ہے۔ ان میں سے چند کا ذکر درج ذیل ہے۔

(ا) اسمیا بھاشا

اسمیا بھاشا کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے چھگن لال جین لکھتے ہیں ماہرین لسانیات کی رایوں کے مطابق اسمیا زبان کا ارتقا بنگلہ، اڑیا، میتھلی کی طرح مگدھی اپ بھرنش سے ہوا۔ دسویں صدی سے پہلے کے شیلا لیکھوں (کتبوں) سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں یہاں کی راجیہ بھاشا سنسکرت تھی۔ اونچے طبقے کے لوگ سنسکرت ہی لکھتے بولتے تھے اور عوام کا وسیلہ اظہار مگدھی پراکرت تھی۔ اس زمانے کے اسم Asam یعنی کامروپ راجیہ میں مگدھی پراکرت کا مروپی پراکرت کے نام سے مشہور ہے۔ لہذا مانا جاتا ہے کہ اسمیا (آسامی) بھاشا کامروپی پراکرت یا مگدھی کے مروجہ اپ بھرنش سے پیدا ہوئی۔

اسمیا بھاشا پر تبتی، برمی اور اسٹرک زبانوں کا بھی اثر ہے۔ اسمیا کے لفظی ذخیرے میں غیر آریائی زبانوں کے علاوہ سنسکرت اور دوسری ہند آریائی زبانوں کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔

ساتویں صدی کے نصف اول میں چینی سیاح ہوانگ سانگ ہندوستان آیا تھا اس نے بتایا کہ ''درمیانی ہندوستان کے عوامی بھاشا سے کامروپ کی عوامی بھاشا ملتی جلتی ہے۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی لکھتے ہیں ''اسامی اپنی آزاد راجیہ اور سماجی ماحول کے دائرے میں ترقی پذیر ہوئی۔ تقریباً تین چار سو برسوں تک صرف بول چال کی زبان رہی۔ تیرھویں صدی میں اس نے ادبی روپ اختیار کیا۔''

اسمیا زبان کے قدیم دور میں بیراگی بھکتوں کے گیتوں، بودھ سدھیوں کے دوہوں اور مین ناتھ، مست تیندر ناتھ، لوہی پاد، سرہ پاد وغیرہ کے گیتوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ شعری تخلیقات میں پہیلیوں کا بھی خاص مقام تھا۔ آسامی زبان کے

قدیم نمونوں کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

تری لوکیئے کنیا مہاروپ وتی
سندر ناسیکا دنت مکتاریتی
منال مرگال بھوکرش مدھیہ دیش
کمل نیئے نی انکوچت کیش
اتھر دھن جن جیون یوون
اتھر اہو سنسار
پترپری دار سب ہی اتار
کرے بوکاہے ری سار
کمل دت پل چتر چینچل
چر نہیں تل اک
نہیں بھوبھئے بھورے ہری ہری
پربھ پدپر تیک

(۲) اڑیا بھاشا

اڑیا زبان کے ماہر لسانیات ڈاکٹر بنشی دھر موہنتی اڑیا زبان کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ماہرین زبان کے مطابق پوربی مگدھی سے صرف اڑیا ہی نہیں بلکہ بہاری، بنگلہ اور اسمیا وغیرہ زبانیں نکلیں ہیں۔" وہ مزید لکھتے ہیں "قدیم اڑیا زبان کی ترقی کا زمانہ متعین کرتے وقت ہمیں پہلے بودھ گان دوہا کے بارے میں غور کرنا ہوگا۔

سدھ ساہتیہ پر تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنو پادر، شبر پاد، لوہی پاد، جالندھر، کمبل، راہول بھدر، استی دھن وغیرہ ۶۰۰ عیسوی سے ۱۰۰۰ عیسوی تک محیط ہیں اور ان کے دوہے کسی ایک زمانہ اور ایک علاقہ تک محدود نہیں۔

بودھ گان دوہا کی زبان قدیم اڑیا زبان کے خدوخال سے ملتی ہے جن بدھ

سدھیوں کے یہاں زبان کا یہ قدیم روپ ملتا ہے ان میں سے چند کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

لوہی پا، ہین ناتھ، گورکھ ناتھ، شیور یپا، کمل روپا، کن ہو پا اور ہاری پا۔

ڈاکٹر بنشی دھر موہنتی نے سدھی ادب کے کچھ نمونے پیش کئے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:۔

ایک یے ہوئی دوئی الگ الگ
نرہوں، نرانترے ہوالگ
سی شومنا مدھیئے سیوتی پرکاش
وندنی ناتھے یے ہی سدھنکر وشواس
وندے گری اسی گری پشیا گری میلا
ہستی چرائی پروت مالا
یے دن سے ہستی مہارس کھائی
وینی پچھی چھیدلیے گگنے سمائی

''وشنودیو''

(۳) گجراتی بھاشا

گجراتی زبان کے آغاز اور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر چندر کانت مہتا لکھتے ہیں:۔

''ویدکال کی بھاشا سے علاقائی خصوصیات کی حامل مختلف پراکرتک بھاشاؤں کا آغاز ہوا۔ جن میں شورسینی بھی ایک تھی۔ شورسینی سے اپ بھرنش کا آغاز ہوا۔ جس سے آریا خاندان کی موجود زبانیں ہندی، گجراتی، مراٹھی، بنگلہ وغیرہ پیدا ہوئیں۔'' بارہویں صدی سے سولہویں صدی تک گجرات، مارواڑ اور راجستھان میں جو بھاشا مروج تھی اسے ڈاکٹر ٹے سی ٹوری قدیم پچھمی راجستھانی کہتے ہیں۔ اور نرسنگھ راؤ دوبٹیا اسے آخری اپ بھرنش کہتے ہیں۔ پندرہویں صدی سے گجرات کا راجستھان

کے ساتھ تعلق ٹوٹ گیا۔ سولہویں صدی سے گجرات، راجستھان سے سیاسی طور پر الگ ہوگیا۔ گجرات میں آزاد مسلمانی اقتدار قائم ہوگیا اور اس طرح سیاسی وجوہ سے گجراتی اور راجستھانی الگ الگ بھاشائیں ہوگئیں۔ (جیسے اردو اور ہندی سیاسی وجوہ سے الگ الگ بھاشائیں ہوگئیں۔ ب۔ا)

گجراتی کے ابتدائی دور میں سدھی شالی بھدر سوری، وِنے چندر سوری سوم سندر، ہری بھدر سوری، رشبھ داس کے نام آتے ہیں۔

(۴) بنگلہ بھاشا

بنگلہ بھاشا کے آغاز اور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اندرناتھ چودھری لکھتے ہیں: قدیم زمانے میں ہندوستان کے پوربی حصے میں قدیم آریا زبانوں کی آمد سے پہلے آسٹرک گروہ کی ذیلی زبانیں، کول منڈا وغیرہ مروج تھیں، دسویں صدی ق م میں ان علاقوں میں آریا زبانوں کی آمد ہوئی۔

آریوں کی ویدک بھاشا۔ چھندو بھاشا تھی۔ اس کے اثر سے یورپ کی ایک ریاست جہاں آسٹرک ذات کی ذیلی ذات تیواہ رہتی تھی بنگ کے نام سے مشہور ہوئی، اور اس ریاست میں رہنے والوں کو بنگلہ کہنے لگے۔ پوران میں بنگ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ چندر نسل کے بلی نام کے راجہ ہوئے، ان کے پانچ لڑکے تھے ایک نام بنگ تھا اسی کے نام سے یہ ریاست مشہور ہوئی۔

تقریباً پانچویں صدی ق م میں بنگال میں آریا بھاشا کی دوسری لہر آئی۔ یہ درمیانی ہندوستان کے آریوں کی زبان تھی اس میں کول، منڈا، دراوڑا اور تبت براہمن گروہ کے الفاظ کی کثیر تعداد شامل تھی۔

آٹھویں، نویں صدی میں اپ بھرنش بھاشاؤں کا ظہور ہوا۔ بنگالی اپ بھرنش سے تین بھاشاؤں کا جنم ہوا ان میں اسمیا، اڑیا اور بنگلہ زبانیں شامل ہیں۔

بنگلہ کا قدیم دور دسویں صدی سے چودھویں صدی تک پھیلا ہے۔ اس میں آسامی، اڑیا اور قدیم بنگلا خلط ملط طور پر موجود ہیں۔ ترکوں کے حملے اور

اقتدار میں آنے کی وجہ سے عربی فارسی الفاظ بکثرت شامل ہونے لگے اور میتھلی زبان کا اثر بھی بڑھا۔

بنگال میں قدیم بنگلہ ادب کی بنیادیں مضبوط کرنے میں بودھ سدھوں کا بڑا ہاتھ ہے جو بارہویں صدی تک بنگال میں پھیلے ہوئے تھے۔

بنگلہ ادب کے نقوش اور ہندوستانی ادب (ہندی اردو) کے نقوش ابتدائی طور پر بہت حد تک مشترک ہیں۔

ہرپرساد شاستری نے بودھ گان یا چریاپادشائع کر دیا ہے اس میں ۴۷ گیت ہیں ان کے خالقوں میں لوئی پاد، کنوپا، بھوسک شامل ہیں۔ نمونہ کلام مندرجہ ذیل ہیں:۔

مت ترو پانچ اندری تسوساہا
آسا بہل پات پھل واہا
برگرو بعض کٹھوریں چھی ان

یعنی من کے درخت کی پانچ شاخین (عضو) ہیں۔ آشا (امید) اس کے پتے ہیں پھل بھی ہیں۔ اعلی پیر کے اقوال کی کلہاڑی سی اسے کاٹ ڈالو۔ کہن کہتے ہیں اس درخت کو کاٹ ڈالنے سے پھر جنم نہیں ہوتا۔

(۵) مراٹھی بھاشا

مراٹھا زبان کے آغاز اور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر پربھاکر مانچوے لکھتے ہیں:۔

مراٹھی کا سب سے پہلا تحریری روپ چکرڈے گرام (ضلع ستارا) میں ۷۳۶ عیسوی کا لکھا تام رپٹ ہے۔ اس تحریر ے انعول کی شکل مرہٹ بھاشا کی ہے۔ ۹۸۳ عیسوی کا شرون بیل گولا کا شلا لیکھ (کتبہ) بھی قدیم مراٹھی کی ایک شکل ہے۔ گیارہویں صدی کے بیش چندر جینی پنڈت نے ''راج منی پربود'' لکھی اس میں مراٹھی کے الفاظ ہیں، تیرھویں صدی میں گیانیشوری جیسا گرنتھ لکھا گیا۔

عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کی آمد کے بعد مراٹھی میں عربی فارسی الفاظ کی بکثرت آمد ہوئی۔ نام دیو(۱۳۵۰ـ۱۲۷۰) کے علاوہ ایکناتھ، مکتیشور تکارام اور رام داس نے مراٹھی کو بڑھاوا دیا۔

ناتھ پنتھی سادھوؤں نے بھی اسے بڑھانے میں حصہ لیا۔ ناتھ پنتھی رمتے جوگی تھے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں ان کی زبان پر جگہ جگہ کے اثرات تھے۔ مہاراشٹر میں گہنی ناتھ نے نی ورتی ناتھ (گیانیشور کے بڑے بھائی) کو جو سبق دیا اس میں دھیان یوگ کے ساتھ ساتھ کرشن بھگتی یا اپاسنا مارگ بھی دکھایا۔ ویدک دھرم کے سناتن چتووان اور دیووانی کے خلاف لوک وانی کا پرچار کرنے والے ناتھ پنتھی سادھیوں (سدھی) نے مراٹھی شاعری کی بنیاد رکھی۔

ہرپال دیو(پیدائش ۱۲۲۰ء) نے جو گجراتی تھے۔ مہاراشٹر آکر سدھی گنڈم راول (گووند پربھو) سے ملے اور ان کے زیر اثر اپنا نام چکردھر رکھ لیا۔

(٦)سندھی زبان

سندھی بھاشا کی تشکیل اور ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے موتی لال جوت وانی لکھتے ہیں:

ویدوں کی تخلیق کے وقت سندھ کی وادی میں پرانی بھاشائیں بولی جاتی تھیں۔ پرانی بھارتی آریہ بھاشا کی مختلف بولیاں الگ الگ ریاستوں میں بولی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک بولی کو عالموں نے صاف ستھرا کر کے سنسکرت بنا لیا۔

مدھیہ بھارتی آریہ بھاشا کی آخری منزل اپ بھرنش کہلاتی ہے۔ اسی اپ بھرنش سے مختلف جدید ہندوستانی زبانیں ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔

بھرت ناٹیہ شاستر میں لکھا ہے کہ ہمالیہ سے لے کر سندھو کے کنارے تک کی بھاشاؤں میں زیادہ تر الفاظ بگڑے ہوئے ہیں۔ یہ خاصیت سندھی میں بھی ہے۔ مثلاً گوپالو، کشورو، پڑھنو، لکھنو، وغیرہ۔ یوانگ چوانگ (ہوانگ سانگ) نے لکھا ہے کہ سندھ کے لوگوں کی بھاشا مدھیہ پردیش کی بھاشا سے تھوڑی سی الگ ہے۔ مدھیہ

پردیش میں اتری، گجرات، راجستھان، مالوا، پچھمی اترپردیش اور پڑوسی پردیش آتے ہیں۔ کوولیہ مالا کتھا میں پشاچ (پراکرت روپ پیسایو) کو پیسایا کہا گیا ہے۔

آج کی سندھی بھاشا کی پیدائش پشاچی پراکرت کے "براچڑ" اپ بھرنش سے مانی جاتی ہے۔ "براچڑ" سندھو دیش میں بولی جاتی تھی۔ سندھو دیش کو "براچڑ دیش" بھی کہتے تھے۔

سندھی کا قدیم عہد ۱۰۰۰ سے ۱۵۲۲ تک محیط ہے۔ سندھ میں ۷۱۱ میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ تبھی سے یہاں دو رجحان ملتے ہیں ایک اسلامی رجحان ہے اور دوسرا اصل ہندوستانی۔ مسلمان چونکہ ہندوستانی تھے لہذا انہوں نے بھی اصل ہندوستانی دھارا سے خود کو زیادہ الگ نہیں رکھا۔ گیارہویں صدی کے اواخر میں راج پال ابن سومار نام کے ایک سومرا سردار کا ذکر ملتا ہے۔ گیارہویں صدی کے آغاز سے عربی حکومت کے خاتمے کے بعد ۱۰۵۰ عیسوی کے لگ بھگ سندھ کی حکومت کی باگ ڈور سومروں کے ہاتھوں میں آگئی۔ سومروں کا آخری راجہ ہمیر تھا۔ ۱۵۲۱ میں قندھار کے حکمراں شاہ بیگ ارگون نے سما حکمراں جام فیروز کو شکست دی۔ مگر اس نے جام فیروز کو سندھ کے زیریں علاقے پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۵۲۲ میں شاہ بیگ کی موت کے بعد اس کے لڑکے شاہ حسین نے فیروز حکومت کا خاتمہ کر کے سندھ سے مقامی حکمرانوں کے سلسلے کا خاتمہ کردیا۔

دہلی کے سلطان علاؤالدین کے سپہ سالار ظفر خاں نے ۱۲۹۸ میں سندھ پر حملہ کیا۔ ہمیر سومرا اور اس کے بعد کے حکمرانوں کے درباروں میں بھاٹ گیت گاتے تھے اور راجاؤں کی قصیدہ خوانی ہوتی تھی نمونہ ملاحظہ کیجئے:۔

پچھن کرکے سوجھریو، دھدھنی دھودھوکار
اتے ابڑواہی اے وڑے جہاں پانی بورے تار
بن قلمے بندگی کرے توبندگی تی ساس
نیوں تی اٹھ راہ چلنا آخر اجڑ واس

سندھی میں سندھی سادھوؤں کے علاوہ اسماعیلی مبلغوں کے دوہے بھی ملتے ہیں۔ سومرا عہد کے پہلے داعی سیدنورعلادین تھے جو اسماعیلی فرقے کے اٹھارویں امام کے حکم سے سن ۱۰۷۹ میں ہندوستان آئے ان کے سندھی دوہے کا نمونہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ انہیں ست گرونور بھی کہتے تھے۔ ان کے بعد غزنی کے سبزوار شہر سے پیر شمس (۱۱۶۵ـ۱۲۸۰) اور ایران کے پیر صدر الدین (۱۲۹۰ـ۱۴۰۹) آ ئے۔ آخر الذکر نے ویدانت کا مطالعہ کیا اور بڑی تعداد میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ان کے مقلد خوجہ کہلاتے تھے۔ انھوں نے سندھی کی ذیلی زبان کچھی میں دوہے کہے ہیں، نمونہ درج ذیل ہے:

کاشی جائی تمھیں گنگا مانہہ ناہو
تو آمنے تمنے سرجیا، سوکیوں تھے پاؤ؟

سندھی کے چند شعراء کا ضمناً ذکر کیا جاتا ہے (۱) شاہ کریم (۱۶۲۴ـ۱۵۳۶) ان کے ۹۵ بیت دستیاب ہیں، نمونہ:

جا گو جا گو سوئی، جاہیضہ ہیتھ بدھائی
قاسی سیج پریں رے پنو پیاری ناہیں

(۲) دادو دیال (۱۶۵۹ـ۱۶۰۱) انھوں نے اپنے زمانے کی مختلف زبانوں میں شعر کہے ہیں سندھی میں بھی ان کے اشعار ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے:

دادو غافل چھووتے، آہے منجھی مقام
درگاہ میں دوآن تت، پے نہ ویٹھو پان

(بے وقوف کیوں بنتے ہو؟ اس کی جائے رہائش اندر ہے، من ہی سچی درگاہ ہے، اس کو وہاں دیکھو)

ان کے علاوہ شاہ عنایت، (وفات ۱۷۱۹ـیا۱۷۰۱) شاہ لطیف (۱۷۵۲ـ ۱۶۸۹) وغیرہ کا کلام ملتا ہے۔

(۷) پنجابی زبان

پنجابی کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے ''تین ہندوستانی زبانیں'' میں کہا گیا ہے کہ ''مذکورہ بالا سطور میں ہم بتا چکے ہیں کہ دور حاضر کی ہند آریائی زبانیں اپ بھرنش سے ماخوذ ہیں۔ ہیم چندر اپ بھرنش کی بہت سی اقسام کا ذکر کرتا ہے اور ایک دیہاتی اپ بھرنش کا بھی نام لیتا ہے۔ علما کا خیال ہے کہ یہی دیہاتی اپ بھرنش پنجابی کا ماخذ تھی۔''

برج موہن وتاتریہ ''کیفیہ'' میں فرماتے ہیں ''اول یہ خصوصیت ہے کہ شورسینی اپ بھرنش کی جتنی آمیزش پنجابی میں پائی جاتی ہے اتنی کسی ہند آریائی زبان میں نہیں ہے۔''

تین ہندوستانی زبانوں میں درج ہے ''اجمالاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساتویں آٹھویں صدی میں موجودہ پنجابی کا بیج بویا گیا'' ۱۰۰۰ء تک پنجابی اپ بھرنش کے زیر سایہ پرورش پاتی رہی، ناتھ جوگیوں نے اس کو آلہ کار بنا کر اپ بھرنش سے جدا کیا اور ۱۰۰۰ء کے بعد یہ نکھری شکل میں نمودار ہوئی۔

اپ بھرنش کے انہیں شاعروں کا نمونہ پنجابی کے ارتقا میں بھی سامنے آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ لب ولہجہ گجراتی، اڑیا، بنگالی وغیرہ سے قدرے مختلف ہے۔ نمونہ چونکہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ لہٰذا مزید نمونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۸) ہندی بھاشا

ہندی زبان کے تقریباً سبھی مورخ کہتے ہیں ''ہندوستان کے شمالی علاقہ اور مہاراشٹر صوبہ میں جتنی آریہ زبانوں کے متعلق بولیاں بولی جاتی ہیں، ان میں سے زیادہ تر بولیوں کا انحصار اپ بھرنش پر ہی ہے۔ اپ بھرنش ہی شکل بدل کر ملکی زبان کے روپ میں قائم ہے۔''

(ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس۔ اجودھیا پرشاد سنگھ، ص ۴۲)

ہندی کے مورخین نے بھی تقریباً انہیں سدھیوں کی مثالیں دی ہیں جن کا اسمیا، اڑیا، گجراتی، بنگہ، مراٹھی، اور سندھی کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

(۹) اردو زبان

اب اردو کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ جدید ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کا سلسلہ

تو اپ بھرنش سے باضابطہ دکھایا جاتا ہے مگر اردو کے ارتقا کا آغاز مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے اردو پیدا ہوئی۔ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے، سندھی میں عربی، فارسی الفاظ کا ذخیرہ اردو میں عربی فارسی کے ذخیرہ الفاظ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سندھی کا رسم الخط بھی فارسی یا عربی سے ماخوذ ہے مگر اسے کوئی ہندو مسلمان کے اختلاط کا نتیجہ قرار نہیں دیتا۔ اسی طرح مسلمانوں نے سب سے پہلے دکن میں اپنی بستیاں آباد کیں۔ مگر وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی۔ چلیے مان لیا وہاں مسلمان کم تعداد میں آئے ہوں گے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، وہاں تمل پر عربوں کے گہرے اثرات ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے حروف تہجی میں بھی مسلمانوں کے اثر سے چار حروف کا اضافہ ہوا ہے۔ علاوہ ازیں وہاں کے مسلمان تمل بھی عربی رسم خط میں لکھتے رہے ہیں۔ اور آج بھی بہت سے مسلمان عربی رسم میں تمل لکھتے ہیں۔ پروفیسر انصار اللہ نے اس موضوع پر اپنی کتاب ''اردو پر تمل کے اثرات'' میں اچھی روشنی ڈالی ہے۔ مسلمانوں نے بنگالی، گجراتی، مراٹھی، سندھی، پنجابی اور دیگر تمام جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے لیے کام کیا ہے۔ ان تمام زبانوں میں مسلم صوفی شعراء نے کلام کیا ہے اور اس حقیقت سے کوئی بھی مورخ انکار نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ان زبانوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا نتیجہ نہیں قرار دیا جاتا۔

جہاں تک ذخیرہ الفاظ کا تعلق ہے تمام جدید ہندوستانی زبانوں میں چالیس سے ساٹھ فیصد الفاظ عربی فارسی سے ماخوذ ہیں۔ اور اتنے ہی الفاظ اردو میں بھی عربی فارسی سے آئے ہیں۔ اس کے باوجود اردو کو مشرف بہ اسلام کر کے مسلمانوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔

دراصل اردو کا ارتقا بھی بالکل انہیں خطوط پر ہوا ہے جن پر دیگر جدید ہندوستانی زبانوں کا ارتقا ہوا ہے۔ جس طرح گجراتی، پنجابی اور ہندی کے مسلمان صوفی شعراء

عربی رسم خط میں قدرے ترمیم و اضافہ کے ساتھ لکھتے رہے ہیں اور جس طرح ان زبانوں میں عربی فارسی کے الفاظ نے اپنی جگہ بنائی ہے۔ اسی طرح اردو میں بھی ہوا ہے۔ فرق محض علاقے کا ہے، گنگا جمنا کا وہ علاقہ جو ہند کہلاتا تھا وہاں کی اپ بھرنشوں نے ترقی کر کے جس زبان کو صورت دی اسے ہندی، ہندوی اور اٹھارویں صدی میں دہلی کے قلعہ معلیٰ کی تعمیری ضرورتوں کے تحت جب ''اردو'' آباد ہوئی اور پھر قلعہ معلیٰ میں بھی اس کا چلن ہونے لگا تو اس کی رعایت سے اس زبان کو جو در اصل ہندی تھی اردو کہنے لگے۔ پہلے اسے زبان اردوئے معلیٰ کہتے تھے پھر رفتہ رفتہ زبان اردو اور اس کے بعد اردو ہوگئی (وہ خیمہ یا بستی جو شاہی قافلے کی آمد سے پہلے پیش خیمہ کے طور پر قائم ہوتی تھی یا وہ بستی جو بڑے مکانات یا قلعے کی تعمیر سے پہلے قائم کی جاتی تھی اسے اردو کہتے تھے آج جسے ہم جامع مسجد کا علاقہ کہتے ہیں وہ لال قلعہ کی تعمیر کے قائم ''اردو'' تھی)۔

فرانسیسی اور ہسپانوی لوگوں نے جو ہندوستان کے لیے اجنبی تھے، یہی سمجھا کہ ہندوستان میں مسلمان آباد ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ''مور'' یعنی مراقشی کہتے تھے۔ لہذا ان کی زبان کو بھی ''مورش'' کہا۔ پھر علاقے کی مناسبت سے ہندوستانی اڈیکا وغیرہ کہتے رہے۔

جب ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کر کے ملک پر قبضہ کا منصوبہ بنایا گیا تو تاریخ اور زبان کو خصوصی نشانہ بنایا گیا۔ تاریخ میں ایلیٹ اور ڈاؤسن نے اور زبان میں گریرسن اور فورٹ ولیم کے ایک حلقے نے حکمراں انگریزوں کی شہ پر اردو زبان سے فارسی اور عربی کے الفاظ نکلوا کر ایک نئی زبان تشکیل دی اور اردو کے قدیم نام ہندی کو اس نئی زبان کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے باقاعدہ اس بات کا پروپیگنڈہ شروع کیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ انھوں نے اس نئی زبان کے لیے پہلے تو کیتھی اور پھر ناگری رسم خط کو ترقی دی۔ ابتدا میں تو لوگ ورغلانے میں نہیں آئے۔ انہوں نے کھلے عام

ان ۔ شرارت کی مخالفت کی مگر رفتہ رفتہ انگریزوں کی مالی مدد سے متاثر ہو کر ہندی اور اردو کا جھگڑا شروع کر دیا گیا۔ اور اس کام میں بھارتیدو ہریش چندر نے اہم ۔۔۔ یہ صاحب اسی غدار وطن کے صاحب زادے تھے جنھوں نے پلاسی کی ۔۔۔ نگریزوں کا ساتھ دیکر ملک کو غلام بنانے کے لئے اپنے آقا سے غداری کی

جس طرح ایلیٹ اور ڈاؤسن نے مقامی باشندوں سے فارسی میں ہندوستان کی ریخیں لکھوائیں ان میں تحریف کی اور اسی بنیاد پر جھوٹی تاریخیں مرتب کیں، بالکل اسی طرح اپنے ملازموں سے اردو زبان کے بارے میں ایسی باتیں لکھوائیں جن سے بہت سے غلط تصورات پھیل گئے۔

ضرورت ہے کہ جس طرح سے دوسری جدید ہندوستانی زبانوں کے مورخین نے آزادانہ طور پر کام کرتے ہوئے نتائج اخذ کئے ہیں اردو زبان کے مورخ بھی ایسا کریں اور جن مورخین نے اردو کا سلسلہ مسلمانوں کی آمد سے قبل کی زبانوں اور خاص طور پر اپ بھرنش سے جوڑا ہے ان کی باتوں اور دلائل پر غور کریں۔ اور اس بات پر بھی غور کریں کہ دنیا مین کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ اسما کے ملنے سے چاہے ان کی تعداد کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو کبھی کوئی زبان نہیں بنی۔ زبان کا ڈھانچہ ہوتا ہے اور یہ سانچہ اسموں کی شمولیت سے نہیں بدلتا۔

☆☆☆

باغ و بہار کی نثر اور منشی نظام الدین

۱۔ میر امن دہلوی کی کتاب باغ و بہار اپنی بے مثال نثر کی وجہ سے زندہ جاوید بن گئی ہے۔ امن کی دوسری کتاب گنج خوبی کی نثر میں کوئی خوبی نہیں ہے یا کم سے کم وہ خوبی نہیں جو باغ و بہار کا طرہ امتیاز ہے حالانکہ دونوں کتابیں ایک ہی مصنف نے ایک ہی زمانے میں تصنیف کی ہیں۔

۲۔ باغ و بہار فارسی تصنیف چہار درویش کا اردو ترجمہ ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ اسکا ماخذ ''نوطرز مرصع'' ہے لیکن میر امن نے اس کا ذکر دیباچے یا کسی اور جگہ نہیں کیا۔

۳۔ باغ و بہار کی نثر کی تعریف میں تقریباً تمام مورخین ادب رطب اللسان ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اردو ادب کی مختصر تاریخ مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۹۱ء) میں صفحہ 228 پر لکھتے ہیں۔

۴۔ ''ان کی زبان سادگی، سلاست اور متناسب الفاظ کا مرقع ہے اور یہ قاری کو بہجت اور لطافت عطا کرتی ہے، بول چال کی عام زبان نے میر امن کی نثر کو اس عہد کا نمائندہ بنا دیا ہے۔''

۵۔ ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر سید عبداللہ کے حوالے سے بتایا ہے کہ یہ ''زندہ نثر'' ہے اور ڈاکٹر وحید قریشی کے حوالے سے بتایا ہے کہ اس سے ''اردو نثر میں ایک نئی سمت کا پتہ چلا ہے''

۶۔ باغ و بہار کی نثر کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بجا و درست مگر اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی کہ ایک ہی زمانے کی دو تصنیفوں میں ایک ہی مصنف دو طرح کی نثر کا استعمال کرتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اور یہ کہ دونوں کتابوں کے زمانہ تصنیف میں کتنا فاصلہ ہے۔ اور یہ کہ کیا باغ و بہار کی نثر کو زندہ جاوید بنانے میں کسی دوسری شخصیت کا بھی ہاتھ ہے اور اگر ہاں تو کس حد تک۔

۷۔ دراصل باغ و بہار کی زبان کو سادہ سلیس اور جاوداں بنانے میں منشی نظام الدین کا بہت اہم ہاتھ ہے۔ مگر اس طرف کسی محقق یا ناقد نے توجہ نہیں کی۔

۸۔ منشی نظام الدین کے بارے میں واقفیت عام نہیں ہے۔ اردو ادب یا اردو زبان کی تاریخوں میں بھی منشی نظام الدین کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں، لہٰذا منشی نظام الدین کے بارے میں چند سطریں درج کی جاتی ہیں۔ منشی جی کے بارے میں زیر نظر معلومات ان کی کتاب ''AESOP'S FABLES'' سے حاصل کی گئی ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب، خدا بخش لائبریری پٹنہ نے ''حکایات لقمان'' کے عنوان سے 1992 میں شائع کی ہے۔ یہ کتاب 1850 میں اردو ترجمہ اور انگریزی متن کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ عابد رضا بیدار لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک نسخہ خدا بخش میں محفوظ ہے۔ ہمارا نسخہ اردو کی طرف سے بقدر ایک ورق یا دو صفحوں کے ناقص ہے۔ تیسرا صفحہ ''کامل اور سید المرسلین کہلایا'' سے شروع ہوتا ہے یعنی اس کے قبل کے صفحے میں حمد ہوگی اور اس سے قبل اردو سرورق رہا ہوگا چونکہ فی الحال ٹائٹل غائب ہے اس سے فائدہ اٹھا کر ہم نے اپنی طرف سے اسے حکایت لقمان نام دیدیا ہے کہ ایسپ مشرق میں کلیم لقمان کے نام سے مشہور ہیں۔

۹۔ چونکہ اس گوہر کمیاب کی جانب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے توجہ دلائی تھی، اس لیے ان کے قلم سے مختصر تعارف بھی شامل ہے۔

مذکورہ کتاب کے تعارف میں مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں ''اس کے تین نسخوں کا پتہ چلا ہے'' پہلے نسخے کی نشاندہی اقبال کرشن نے یکم نومبر ۱۹۶۴ء کو ہفتہ وار

قومی زبان میں کی۔ اس نسخے میں 114 صفحات ہیں ایک سو قصے ہیں اصل انگریزی موجود ہے۔ سرورق اور پشت ورق غائب ہے۔ چھپائی قدیم اردو ٹائپ میں ہے۔ دوسرے نسخوں کی نشان دہی ہماری زبان یکم دسمبر 1964 میں سلیم تمنائی نے کی ان کے نسخے میں 142 صفحات ہیں اسے رام نرائن لال نے الہ آباد سے شائع کیا، سرورق باتصویر ہے۔

تیسرا نسخہ خدا بخش میں ہے اس میں 184 صفحات ہیں 196 کہانیاں ہیں۔ اسے 1850ء میں فضل الدین صاحب کے چھاپے خانے میں چھاپا گیا ہے۔ ابراہیم صاحب بن محمد فتح نے اسے چھاپا ہے۔

۱۰۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے یا ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے توجہ کے ساتھ ابتدائی صفحات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ انہیں کتاب کا نام معلوم ہو جاتا، صفحہ تین پر درج ہے جب یہ عاجز نقلیات یوسف کے ترجمہ سے فارغ ہوا'' صفحہ 4 کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کتاب کا نام ''نقلیات یوسف'' ہے، صفحہ چار کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منشی نظام الدین پونے میں مقیم تھے۔

۱۱۔ کئی اعتبار سے اس کتاب کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ انگریزی کے صفحات پر اگر توجہ کی جاتی تو کئی ایسی معلومات حاصل ہوتیں جن سے محققین اور طلباء کو مدد ملتی اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ میر امن کی دو کتابوں یعنی باغ و بہار اور گنج خوبی کی زبان میں اختلاف کیوں ہے۔ جبکہ دونوں کتابیں ایک ہی زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا کہ میر امن کی باغ و بہار والی نثر دراصل پورے طور پر میر امن کی نثر نہیں ہے بلکہ اس کو سہل، رواں اور زندہ جاوید بنانے میں منشی نظام الدین کا اہم ہاتھ ہے۔

۱۲۔ انگریزی کا پہلا صفحہ یہ بتاتا ہے کہ ایسوپ کے قیبلس کو انگریزی سے ہندوستانی HINDOOSTANEE میں ترجمہ کیا گیا ہے، اور دفتور اشگرا پریس میں چھاپا گیا ہے، اور اسے ابراہیم فتح محمد کے لیے چھاپا گیا ہے اور فتح محمد ہی اسے فروخت کرتے ہیں، اردو میں چھاپے خانے یا سیل ڈپو کا جائے وقوع نہیں دیا گیا جبکہ

انگریزی میں لکھا ہے ''مسٹر لینن کی لائبریری کے نیچے میاڈو ائیریٹ میں کتاب فروخت ہوتی ہے اور اسے منشی نظام الدین ساکن پونا بھی فروخت کرتے ہیں۔''

۱۳۔ 4 نومبر 1846ء میں بمبئی سرکار کے اصل مترجم وانس کینڈی نے ایک سرٹی فیکٹ دیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ترجمہ درستگی سے کیا گیا ہے اور اس طرح سلیس انداز میں ترجمہ ہوا ہے کہ یہ زبان سیکھنے والوں کو سہولت ہوگی۔''

۱۴۔ انگریزی کا پیش لفظ ہمیں بتاتا ہے کہ منشی نظام الدین ہندوستان اور فارسی کے INSTRUCTOR کی حیثیت سے ملازم تھے اور وہ انگریزی سے ہندوستانی میں ترجمہ کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ انگریزی اور فارسی سے ہندوستانی میں ترجمہ کریں اور اپنی محنت کے ثمرات سے فائدہ حاصل کریں۔ پہلے انہوں نے باغ و بہار کے Revised ایڈیشن کی تیاری میں خود کو لگایا اور بڑی محنت سے متنوع اقسام کے کھانوں، برتنوں وغیرہ کے بیان کو حذف کیا اس طرح کے بیانات سے کتاب بھری ہوئی تھی اور اس کی وجہ سے قاری کے ذہن پر بوجھ پڑتا تھا اور اسے سیکھنے میں دشواری ہوتی تھی۔ اور ان کے معانی سے واقف ہونے اور انہیں ذہن نشین کرنے میں جو مشقت ہوتی تھی وہ لاحاصل تھی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ساخت بہت بے ہودہ تھی اور یہ خرابی اس قدر عام تھی کہ اس کی بہ نسبت برتنوں اور کھانوں وغیرہ کی غیرضروری تفصیلات کی خرابی کا درجہ کم ہو جاتا تھا۔ انہیں خرابیوں کو دور کرنے کے لیے منشی نظام الدین نے باغ و بہار پر نظر ثانی کی۔ اگرچہ باغ و بہار کا مصنف ہوشیار تھا مگر اس نے جملوں کی ساخت اور لفظوں کی ترتیب کے معاملے میں غلطی کی۔ مگر اس طرح کی غلطی حیرت انگیز نہیں معلوم ہوتی خاص طور پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ کن حالات میں یہ کتاب لکھی گئی۔

پیش لفظ میں مزید لکھا ہے:

جب یورپ والے اس ملک میں پہلے پہل آباد ہوئے اور انتظامیہ کے معاملات

میں مصروف ہوئے تو انہیں مروجہ زبان کی جانکاری کی ضرورت پڑی، لیکن ان کے لیے یہ زبان سیکھنا بے حد مشکل تھا اس لیے کہ اس زبان میں کتابیں نہیں تھیں اس کمی کو دور کرنے کے لیے چند ذہین منشیوں کو سرکار نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی نگرانی میں مقرر کیا، گل کرسٹ کی کوشش سے ایک قاعدہ تیار کیا گیا۔ اور ان منشیوں کو سرکار نے بڑے Reward بھی دئے، انہوں نے ہندوستانی زبان میں کئی کتابیں تیار کیں، ان میں باغ و بہار اور اخلاق ہندی شامل ہیں، چونکہ یہ کتابیں اردو میں اپنی نوع کی پہلی کتابیں تھیں ان میں نقائص کا ہونا لازمی تھا ان کی سب سے نمایاں خرابیاں وہ تھیں جن کا سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی اکثر و بیشتر الفاظ کا جملوں میں اپنے مناسب مقام پر نہ ہونا۔ راقم الحروف کا خاص فریضہ یہ تھا کہ وہ ان الفاظ کو صحیح مقام پر رکھے۔

چونکہ کسی بھی سائنس کی شروعات میں کمی اور غلطی کا ہونا ضروری ہے اس لیے تکمیل کا تقاضا عبث ہے اور چونکہ ابتدائی کتابوں کے مصنف ناتجربہ کار تھے لہذ مذکورہ بالا خرابیوں کا ہونا ناگزیر تھا۔

ہر ایک زبان کے لیے اچھے گرامر اور مناسب ڈھنگ سے جملوں کی ترتیب پر توجہ ضروری ہے جو کتابیں کلکتہ میں چھپیں وہ شہر دہلی کی اصل زبان میں جس کو اردو زبان کہتے ہیں لکھی گئی تھیں۔ ان کی زبان، قواعد، محاورے اسلوب وغیرہ ہر لحاظ سے درست تھیں۔ البتہ ایک استثنیٰ ہے۔ یعنی جملوں میں الفاظ کا بے محل استعمال۔ مثال کے طور پر باغ و بہار کی پہلی سطر دیکھئے، مصنف نے لکھا ہے "حقیقت زبان اردو کی" جبکہ ہونا چاہئے "اردو زبان کی حقیقت" پھر کتاب کے بیانیہ کے آغاز میں لکھتے ہیں "ہر ایک صوبے سے عرضی بدعملی کی" جبکہ ہونا چاہئے "بدعملی کی عرضی" یا "عرضی بدعملی" اور پھر اسی صفحے پر "سیر چہار درویش کی" لکھا ہے جب کہ ہونا چاہئے "چار درویش کی سیر میں"۔

منشی نظام الدین لکھتے ہیں "اس طرح کی غلطیاں ہر صفحے پر بکثرت ہیں بعض

لوگ کہتے ہیں دونوں طرح سے درست ہے مگر یہ بات نہیں، اول الذکر طرز اظہار کاہلانہ اور بے پرواہ گفتگو کی عادت کا نتیجہ ہے۔

منشی نظام الدین لکھتے ہیں مذکورہ کتابیں زیادہ تر فارسی سے ترجمہ ہیں بہت اچھی طرح لکھی گئی ہیں مگر ان کا اسلوب فارسی ہے اور ضرورت سے زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ چاپلوسی، بے ہودہ، تشبیہات، غیر ضروری تکرار اور شاعرانہ طرز اظہار کی بچکانہ کوشش، کم اہم چیزوں کا طولانی بیان اور وہ سب چیزیں جن کی وجہ سے فارسی پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے مگر یہ حسن زبان یعنی فارسی کا حسن سمجھی جاتی ہیں۔ اگر ان چیزوں کے بغیر فارسی لکھی جائے تو یہ زبان بہت سادہ اور سہل ہوگی مگر فارسی والوں کے ذوق کے مطابق نہیں ہوگی۔ سادہ چیزوں کے بیان میں بھی فارسی والے دوراز کار تشبیہات، رنگینی اور مبالغے سے کام لیتے ہیں اور اس معاملے میں فارسی زبان نے دنیا کی تمام زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، ہر موقع پر، بول چال ہو چاہے تحریر، لمبے جملے اور تکرار سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح غیر ضروری الفاظ ہندوستانی میں بھی خلط ملط ہوتے ہیں اور اکثر انہیں حسن سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستانی منشی چونکہ فارسی کے رسیا اور عادی ہیں اس لیے خالص ہندوستانی زبان میں لکھی گئی کتاب انہیں نہ صرف یہ کہ پسند نہیں آئے گی، بلکہ وہ اس کی مذمت کریں گے مناسب ترتیب سے لکھی گئی کتاب بہت آسان ہوگی، مثلاً راقم الحروف کی ترجمہ کی ہوئی حکایات۔

منشی نظام الدین اظہار بیان اور خاص طور پر ترجمہ کے فن سے بخوبی واقف تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے بڑی پُر مغز باتیں لکھی ہیں ان کے دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے تک اردو پر انگریزی کا اس حد تک عمل دخل ہو چکا تھا کہ اردو کے الفاظ کی جگہ بہت سے انگریزی الفاظ اس طرح مروج ہو گئے تھے کہ عام ہندوستانی ان انگریزی الفاظ کو ہندوستانی زبان کے الفاظ سمجھنے لگے تھے۔ مثلاً جراب کی جگہ اسٹاکن مروج ہو چکا تھا اور دکاندار اسے ہندی کا لفظ سمجھتے تھے۔ منشی نظام الدین نے زبان کے سلسلے میں ہندوستانیوں کی لاپرواہی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ یہ بھی

نہیں مانتے کہ لفظوں کی غلط ترتیب قواعد کے خلاف ہے۔ وہ مشہور ضرب المثل کے مطابق گاڑی کو گھوڑے سے آگے جوتتے ہیں۔

منشی نظام الدین کو انگریزی زبان پر قدرت تھی انہوں نے اردو منشیوں کی تصانیت پر نظر ثانی کے علاوہ کئی کتابوں کا فارسی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا، جن میں ہندوستانی اکپس فیبلس، نیو آرٹیکل آف وار اور انشائے ہندی شامل ہیں۔ انہوں نے ''ہنری اینڈ ہزبیرا'' نامی کتاب کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ منشی جی مراٹھی بھی جانتے تھے اور انہوں نے مراٹھی سے بھی اردو میں ترجمے کئے تھے۔ منشی جی ہندی، ہندوستانی اور اردو تینوں کو مترادف کے طور پر استعمال کرتے ہیں البتہ اردو کو دہلی سے منسوب کرتے ہیں، وہ پونا کے باشندے تھے اور اکثر بمبئی آتے رہتے تھے۔

باغ و بہار کی عمدہ صاف اور سلیس نثر کے لئے میر امن کو تہنیت پیش کیا جاتا ہے۔ رشید حسن جیسے محتاط محقق کو بھی دھوکہ ہوا اور انھوں نے بھی دوسرے محققین کی طرح باغ و بہار کی زبان کی سلاست کا کریڈٹ میر امن کو دیا ہے۔ جب کہ در اصل یہ کریڈٹ منشی نظام الدین کو جاتا ہے۔

باغ و بہار طلبا کے درس میں شامل ہے اور ناوقفیت کے سبب وہ سب گمراہ ہو رہے ہیں ضرورت ہے کہ اس ہمالیائی غلطی کو درست کیا جائے اور حقدار کو اس کا حق دیا جائے۔

ماخذ

ا۔ حکایات لقمان مطبوعہ خدا بخش لائبریری اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ سن اشاعت 1992ء

۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر انور سدید

۳۔ باغ و بہار۔ مختلف ایڈیشن مصنف میر امن۔

☆☆☆

ترجموں کا تقابلی مطالعہ

ہر شخص جو بولتا ہے وہ محدود معنوں میں مترجم ہے، اس لئے کہ بولنا دراصل ترجمہ کرنا ہے۔ انسان تمام زندگی نثر بولتا ہے مگر اسے یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ نثر میں کلام کررہا ہے۔ٹھیک اسی طرح انسان ترجمہ کرتا مگر اسے یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ ترجمہ کررہا ہے۔

یوں تو ہر شخص بولتا ہے جسکا آلہ نطق درست ہے اور تھوڑا بہت تربیت ملی ہے۔مگر بہت کم لوگ اپنی بہتر ترجمانی یا ترجمہ کرپاتے ہیں۔اس کے کئی اسباب ہیں فی الحال ان سے بحث نہیں۔اسی نااہلیت کے باعث ترسیل کا المیہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر کسی بچے کے بولنے کے ارتقائی عمل کا آپ مشاہدہ کریں تو واضح ہوگا کہ گرچہ بولنا فطری عمل ہے مگر اس کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ بچے کے اعزا اسے بولنا سکھاتے ہیں۔عورتیں مردو کی بنسبت زیادہ بولنے کا وصف رکھتی ہیں اس لئے کہ اپنے بچے کو بولنا سکھانے میں ان کا رول اہم ہوتا۔وہ بچے سے لایعنی گفتگو کرتی ہیں اس کی وجہ سے بچے کو بولنا سیکھنے میں سہولت ہوتی ہے۔رفتہ رفتہ جیسے جیسے بچے کے آلات نطق بڑھتے ہیں اس کا ذخیرہ تجربات بڑھتا ہے اس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے، بولنے کی مشق بڑھتی ہے ترسیل میں سہولت اور بلوغت آتی جاتی ہے۔

جس طرح بولنے میں تجربے کے ذخیرے اور مشق (ریاض) کی اہمیت ہے اسی طرح ترجمے میں ذخیرہ الفاظ، تجربے کے ذخیرے اور مشق کی ضرورت ہے۔ جس مترجم کا ذخیرہ الفاظ بہتر ہے، مشق بہتر ہے اور تجربے کا ذخیرہ بہتر ہے اس کا

ترجمہ بہتر ہو گا۔

ذیل میں چند عبارتوں کے ترجمے دیئے جارہے ہیں، ان سے قارئین کو اندازہ ہو گا کہ مذکورہ بالا باتیں کس حد تک درست ہیں۔ آل احمد سرور اپنے مضمون تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل مطبوعہ ترمہ کا فن اور روایت مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس میں لکھتے ہیں۔

''ارسطو کی کتاب فن شاعری (Poetics) یا بوطیقا، مغربی تنقید کا صحیفہ اول کہی جاتی ہے۔ آج تک مغربی تنقید میں اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے پر بحث ہوتی ہے۔ اور اس سے برابر نئے معنی اور مطالب نکالے جاتے ہیں۔ یہ ان بنیادی کتابوں میں سے ہے جن کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں موجود ہے اردو میں اس کا ترجمہ عزیز احمد نے 1941ء میں تھا۔ عزیز احمد کا ترجمہ عام طور پر اچھا سمجھا جاتا ہے۔ مگر ارسطو کی ٹریجڈی کا ترجمہ ملاحظہ کر کے آپ خود فیصلہ کیجئے۔ پہلے انگریزی ملاحظہ کیجئے پھر عزیز احمد کا ترجمہ پھر اس پر تنقید اور آخر میں میرا ترجمہ۔

" Tragedy ,then ,is an imitation of
an action that is serious,complete,and
of a certain magnitude; in language
embellished with each kind of artistic
ornament, the several kinds being
found in separate parts of the play; in
the form of an action ,not of narrative,
through pity and fear effectings, the
proper purgation of :nese emotions"

عزیز احمد کا ترجمہ درج ذیل ہے ''ٹریجڈی نقل ہے کسی ایسے عمل کی جو اہم اور مکمل اور ایک مناسب عظمت (طوالت) رکھتا ہو جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو۔ جس کے

حظ حاصل ہوتا ہولیکن مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے جو دردمندی اور دہشت کے ذریعے اثر کر کے ایسے ہیجانات کی اصلاح کرے''

آل احمد سرور لکھتے ہیں ''اردو میں اوقاف کا کم ہی استعمال ہوتا ہے۔عزیز احمد نے صرف اسلئے ''کامے'' اور ''وقفے'' کا استعمال کیا ہے۔حالانکہ انگریزی میں کاما اور کولن کا استعمال ہے۔جملہ ایک ہی ہے۔عزیز احمد نے ایک جملے کا ترجمہ چار جملوں میں کیا ہے اور بعض ضروری الفاظ چھوڑ دئے ہیں۔بعض الفاظ کے ترجمے سے بھی میں متفق نہیں ہوں۔۔۔۔Serious کا ترجمہ ''اہم'' کے بجائے ''سنجیدہ'' ہونا چاہئے تھا۔

Magnitude کے لئے اردو میں سامنے کا لفظ ''حجم'' موجود ہے۔اس کے لئے مناسب عظمت اور پھر ''قوسین'' میں ''طوالت'' لکھنا غیر ضروری تھا۔مزین زبان کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے حظ حاصل ہو'' IN the form of action not of narrative کا ٹکرا جو بہت اہم ہے چھوڑ دیا گیا ہے۔پھر katharsis یا purgation کے لئے ایک لفظ کے بجائے دو لفظ ''صحت واصلاح'' ہیں اس لئے میرے نزدیک نہ تو اس شکل میں مطابق اصل ترجمہ ہے نہ لفظی بلکہ ادھورا اور ناقص ترجمہ ہے اس سے اصل کی روح مجروح ہوتی ہے۔میرے نزدیک انگریزی عبارت کا ترجمہ کچھ اس طرح ہونا چاہئے۔

''بس ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقالی ہے جو سنجیدہ مکمل اور مناسب حجم کا ہو، جس کی زبان ہر قسم کی نئی آرائش سے مزین ہو اور (آرائش) کی یہ قسمیں کھیل کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہوں۔یہ عمل کے روپ میں ہو نہ کہ بیانہ کے، اور رحم اور خوف کے ذریعہ سے جذبات کا تنقیہ کرے۔''

تنقیہ کے علاوہ ایک اور لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے تزکیہ فرق یہ ہے کہ تنقیہ طب کی اصطلاح ہے اور تزکیہ تصوف کی۔تنقیہ میں فاسد مادے کے خارج ہونے اور پھر جسم کے نظام کے صحت پانے کا مفہوم موجود ہے۔تزکیہ میں رفعت اور پاکی کا

مفہوم ہے۔ صحت و اصلاح سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ جو میرے نزدیک Katharsis کا ہے۔

آل احمد سرور صاحب مزید لکھتے ہیں ''بنیادی کتابوں کے متن کا ترجمہ قطعی طور پر مطابق اصل ہونا چاہیے۔ اس میں تبدیل کی گنجائش ہے نہ اضافے کی۔ نہ کسی لفظ یا فقرے کو حذف کرنے کی۔ اس لئے اردو میں ''فن شاعری'' کے ایک اور ترجمے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے عنوان ''بوطیقا'' جیسے ثقیل عربی لفظ کے بجائے صرف فن شاعری یا ''شعریات'' لکھنا کافی ہوگا۔ عزیز احمد نے بھی فن شاعر ترجمہ کیا ہے اور برائیکیٹ میں بوطیقا لکھا ہے۔ جمیل جالبی نے بھی بوطیقا کو برقرار لکھا ہے۔ البتہ شمس الرحمان فاروقی شاعری اور شعریات کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی Poetics کا ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے پر بات کرنے سے پہلے جمیل جالبی کے ایک ترجمے پر آل احمد سرور کے اعتراضات سنئے ''جمیل جالبی نے ایلیٹ کے کچھ مضامین کا ترجمہ کیا ہے۔ جس کی عام طور پر تعریف کی گئی ہے۔ ایلیٹ کے ایک مضمون Tradition & individual talent کے ایک اقتباس اور جالبی کے ترجمے پر غور کیجئے۔ دیکھیں آپ کے پلے کیا پڑتا ہے۔ (آل احمد سرور)

ایلیٹ کے مذکورہ مضمون پر تو پھر بات ہوگی۔ فی الحال ڈاکٹر جمیل جالبی نے Poetics کی محولہ بالا عبارت کا جو ترجمہ کیا ہے اسے ملاحظہ کیجئے۔ ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقل ہے یا نمائندگی ہے جو سنجیدہ توجہ کے لائق ہو۔ وہ اپنی جگہ مکمل بھی ہو اور کچھ وسعت بھی رکھتی ہو۔ ایسی زبان میں جو فنی صنائع سے معمور ہو اور ڈرامے کے مختلف حصوں کے مناسب ہو۔ یہ عمل کی شکل میں پیش کی گئی ہو اور افسانے کی طرح بیان نہ کی گئی ہو۔ خوف اور ترس کے ذریعہ ایسے جذبات کا تزکیہ بھی کرتی ہو'

مذکورہ بالا تینوں اکابرین ادب نے اپنے طور پر جو ترجمے کئے ہیں ان سے

ترجمے کا حق ادا ہو جاتا ہے۔عزیز احمد کا پہلا ترجمہ ہے اور اچھا ترجمہ ہے پوری کتاب سے ایک آدھ عبارت چن کے اس پر تنقید کرنا اور اسے بہتر بنانا آسان ہے مگر معترض تو یہ بھی دھیان رکھنا چاہئے کہ پوری کتاب کے ترجمے میں ایک آدھ عبارت کی کمزوری پر گرفت معقول نہیں۔سرور صاحب کے ترجمے سے جمیل جالبی صاحب کا ترجمہ بہتر ہے۔مگر بہتر سے بہترین کی گنجائش بہر حال باقی رہتی ہے میں نے بھی کوشش کی ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔میرے نزدیک اس ترجمے سے مصنف کی بہتر ترجمانی ہوتی ہے۔

''تو ٹریجڈی کسی عمل کی نقال ہے یہ سنجیدہ مکمل اور ایک خاص حجم کی حامل ہوتی ہے۔اس کی زبان ڈرامے کے ہر حصے کے مطابق مختلف فنی لوازمات سے آراستہ ہوتی ہے۔یہ حرکت و عمل کی عکاسی ہوتی ہے بیانیہ نہیں۔خوف اور رحم کے ضربات کے اثر سے یہ ناظرین کے جذبات کی بہتر تطہیر کرتی ہے''

آل احمد سرور نے اعتراض کیا ہے کہ عزیز احمد نے Serious کا ترجمہ 'اہم' کیا ہے حالانکہ اس کا ترجمہ سنجیدہ ہونا چاہئے تھا۔سرور صاحب کا اعتراض درست نہیں۔سیاق و سباق اور عصری تقاضوں کے مطابق اس لفظ کا ترجمہ ''اہم'' مناسب ہے۔کیتھارسس کا ترجمہ آج کے حالات مین تزکیہ، تنقیہ وغیرہ کر سکتے ہیں۔مگر جس زمانے میں عزیز احمد نے ترجمہ کیا تھا اس کے تقاضوں کے عین مطابق یہ تھا کہ وہ ''صحت و اصلاح'' لکھتے۔

مذکورہ بالا تینوں ترجموں میں ''جو'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔یہ گمراہ کن ہے اس طرح یہ شبہ ہوتا ہے کہ ''جو'' عمل کے لئے استعمال ہوا ہے۔یعنی جو بات ٹریجڈی کے لئے کہنی ہے وہ عمل کے لئے کہی جا رہی ہے۔یہاں ''ایسے'' اور ''جو'' کے استعمال کی ضرورت نہیں تھی۔مگر ایک کوتاہی جو عزیز احمد سے ہوئی اسے آل احمد سرور اور جمیل جالبی دونوں نے برقرار رکھی ہے۔دراصل بنیادی غلطی انگریزی مترجم سے ہوئی ہے اسے this is کی بجائے It is لکھنا چاہئے تھا۔

ہمارے تینوں اکبرین سے غلطی اس لئے ہوئی کہ انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ مصنف کسی action کے بارے میں نہیں بلکہ ٹریجڈی کے بارے میں بتا رہا ہے کہ ٹریجڈی، سنجیدہ اور مکمل ہوتی ہے۔

Poetics کا ترجمہ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کیا ہے۔اور آل احمد سرور کے مشورے کے مطابق Poetics کا ترجمہ فن شاعری اور شعریات کیا ہے۔محولہ بالا عبارت کا ترجمہ جو فاروقی صاحب نے کیا ہے مندرجہ ذیل ہے۔

''لہذا۔المیہ ایک ایسے عمل کی نمائندگی کرتی ہے جو سنجیدہ،توجہ کے لائق بذات خود مکمل اور ایک خاص حجم کا حامل ہو۔اس کی زبان ہر طرح کے صنائع بدائع سے مزین ہوتی ہے۔جو ڈرامے کے مختلف حصوں میں،ان کی مناسبت سے استعمال ہوتے ہیں۔اس کی ہیئت بیانیہ نہیں عملیہ ہوتی ہے۔اور یہ دردمندی اور خوف کے ذریعہ ان جذبات کی اصلاح اور مناسب تنقیہ کرتا ہے۔''

قارئین کے سامنے 5 ترجمے ہیں۔مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر مترجم کو یہ احساس ہے کہ وہ مصنف کے مافیہ تک یا تو پوری طرح پہنچ نہیں سکا یا جو کچھ اس نے سمجھا ہے اسے پوری طرح سے زبان کا قالب نہیں دے سکا۔

اب ایک اور انگریزی عبارت اور اس کے ترجمے ملاحظہ کیجئے۔

"Whe you pray". he siad, " you transcend your body and become a partof the cosmos, which knows no divosion of wealth ,age caste,or creed."

اس کا ترجمہ حبیب الرحمٰن چغتائی نے اس طرح کیا ہے۔''جب تم عبادت کرتے ہو تو تمہارا جسم بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے اور تم کائنات کا حصہ بن جاتے ہو اور کائنات دولت،عمر،ذات پات یا عقیدہ کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرتی''پرواز صفحہ 7۔اس کا ترجمہ میں نے اس طرح کیا ہے۔

جب تم نماز پڑھتے ہو تو اپنے جسم سے ماورا ہو کر کائنات کا حصہ بن جاتے ہو، جہاں دولت،عمر،ذات یا مذہب اور مسلک کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی۔

اس عبارت کا ترجمہ سید محمد ظفر علی نے بھی کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔ ''جب تم عبادت کرتے ہو تو تم اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر کائنات عالم کا ایک جزو بن جاتے ہو جو عمر، ذات، رنگ و نسل اور دولت کی تقسیم کے فرق سے واقف نہیں۔'' کون ہیں کلام صفحہ 222

میں نے عبادت کی بجائے نماز کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے کہ یہاں بات چیت نماز کے سیاق میں ہو رہی ہے۔ چغتائی صاحب نے تو جسم کے ساتھ ہی پرواز کرا دیا۔ان کا ترجمہ اچھا ہے مگر اس میں بڑی بھیانک غلطیاں ہیں۔ عبدالکلام صاحب کا پوانام ہے ''ابوالفقیر زین العابدین عبدالکلام'' چغتائی صاحب نے اسے ابولفاخر زین العابدین' کردیا۔اسی طرح one of her fore bears having been bestowed the title of 'Bahadur' by the british.

کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے ''بہادر'' کی جگہ ''خان بہادر'' کردیا۔ظاہر صدر کی والدہ محترمہ کے خاندان میں کم سے کم خان بہادر تو ہونا ہی چاہئے۔سب سے عمدہ ترجمہ تو وہ ہے جہاں تیسری دہائی کا ترجمہ ''ساٹھویں دہائی'' کیا گیا ہے۔

I had three close friends in my childhood---Ramanandha sastri,Arvidan,and Sivaprakasan:

اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے۔ ''بچپن کے تین میرے قریبی دوست تھے۔'' حالانکہ اسے آسان زبان میں اس طرح لکھ سکتے تھے۔ ''بچپن میں میرے تین قریبی دوست تھے۔'' راما نند کو ہر جگہ رام نندھن لکھا گیا ہے۔

انگریزی کا جملہ ہے:- Every child is born,with some inherited characteristics,into specific socio -economic and enotional environment, and trained in certain ways by figures of authority

اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ''ہر بچہ ورثے میں کچھ صفات لے کر مخصوص سماجی ،معاشی اور جذباتی ماحول میں پیدا ہوتا ہے اور بالا دست ہستیوں کے ذریعہ مختلف ڈھنگ سے اس کی تربیت ہوتی ہے۔'' حالانکہ اس کا فام فہم انداز میں اس طرح ترجمہ ہو سکتا تھا۔''ہر بچہ خاص اقتصادی، سماجی اور جذباتی ماحول میں کچھ موروثی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوتا پھر اس کے والدین ، بزرگ اور اساتذہ اسے خاص ڈھنگ سے تعلیم و تربیت دیتے ہیں۔ یہاں figures of authority کا ترجمہ ''بالا دست ہستیوں'' مضحکہ خیز اور بھدا ہے۔ یہاں تک تو چلئے کسی طرح گوارا ہے مگر اس سے آگے کا ترجمہ تو ''ارتھ کا انرتھ'' ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ انگریزی کا جملہ ہے۔ I inherited honesty and self -discipline from my father; from my mother ,I inretited faith in goodness and deep kindness and so did my three brothers and sisters

اس کا اردو ترجمہ جو چغتائی صاحب نے کیا ہے اس طرح ہے''میں نے ایمانداری اور خود نظمی اپنے باپ سے ورثے میں پائی جب کہ نیکی میں یقین اور گہری ہمدردی مجھے میری ماں، تین بھائیوں اور بہن نے عطا کی۔'' اس کا با محاوہ ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے تھا۔''مجھے اپنے والد سے ورثے میں دیانت داری اور خود نظمی ملی اور ماں سے اچھائی پر اعتماد اور گہری رحم دلی کے جذبات۔ یہی صفات میرے تینوں بھائیوں اور بہن کو بھی ملے۔''

ترجمہ پر نظر ثانی کی ضرورت تھی مگر شائد ایسا ہوا نہیں ورنہ اس طرح کی بھیانک غلطیاں راہ نہ پاتیں۔ About hundred کا ترجمہ ''تقریباً تین سو'' تو نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح Introduction میں ایک جگہ لکھا ہے the short space of" three years"

اس ''تین سال'' کا ترجمہ ''تین مہینے'' کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ترجمے کی بے شمار

غلطیوں سے پر ہے۔

عجیب و غریب ترجمے کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ”ترجمہ کا فن اور روایت“ میں فرانسیسی شاعر پال ویلری کے ایک بیان کا انگریزی ترجمہ درج کیا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہے۔

To trnaslate is to reconstitute as early as possible the effect of a certain cause(The original) by means of another cause (the translation)

اس کا اردو ترجمہ بھی ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا ہے جو اس طرح ہے۔

”ترجمہ کرنا، کسی علت (اصل تخلیق) کے معلول کی، ایک دوسری علت (ترجمہ) کے توسط سے، امکانی قربت (صحت) کے ساتھ تشکیل نو کرنا ہے۔“ ترجمہ بالکل درست ہے مگر زبان جناتی ہے۔ اسی بات کو مندرجہ ذیل طریقے سے کہہ سکتے تھے۔

”کسی اصل تحریر کے مطالعے سے ذہن پر جو اثرات مرتسم ہوتے ہیں ان کو حتی المکان بڑی حد تک اپنی تحریر میں اس طرح سے منتقل کرنا کہ اصل تحریر کے اثرات دوسری تحریر کے قاری یا سامع تک منتقل ہو جائیں، ترجمہ ہے۔“

ڈاکٹر صاحب انگریزی میں جو مفہوم ہے وہ اس سے اچھی طرح واقف ہیں اور اسے اپنی زبان میں بالکل ٹھیک ٹھیک درج کیا ہے جو مندرذیل ہے۔ ”یہاں ویلری اس بات پر زور دیتا ہے کہ تخلیقی مترجم کا کام کسی فن پارہ یعنی علت ومحرک کی ترجمانی کرنا نہیں بلکہ اس فن پارہ کی قرأت یا سماعت سے جو تاثرات مترجم کے ذہن و تخیل میں بیدار ہوں ایک نئی علت (ترجمہ) کے ذریعہ ان کی باز آفرینی کرنا ہے۔ اس کی وفاداری اصل تخلیق سے نہیں بلکہ اپنے تاثر سے ہوگی۔“

ترجموں میں لفظوں کے پیچھے بھاگنا غیر مناسب ہے۔ اصل بات یہ دیکھنا ہے کہ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہاں ایک بار پھر بات ماحول، روایت اور ذہنی فضا

کی سامنے آتی ہے جس کا ذکر میں اپنے پہلے مضمون میں کر چکا ہوں۔ وہاں میں نے یہ بتایا تھا کہ کس طرح سے لومڑی کی چالاکی کو یورپ میں قابل تعریف سمجھا جاتا مگر ہمارے یہاں اسے بُرا سمجھتے ہیں۔

ہندوستانی میں ترجمے کے سلسلے میں شاید پہلا مضمون منشی نظام الدین ہندوستانی کا ہے۔ انھوں نے باغ و بہار کی زبان کی اصلاح کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

When a sentence translated into Hindoostanee, word for word, according to english the effect would become absurd and unintelligible,as is the case instances in No 116 of the New Article of War

انھوں نے مثال کے طور پر انگریزی کا مندرجہ ذیل جملہ لکھا ہے اور پھر اس کا لفظ بہ لفظ مگر خراب ترجمہ اور پھر اس کا بہتر ترجمہ دیا ہے۔

Any officer or soldier who shall be convicted by a general court Martial of the crime of murder, shall be sentenced to suffer death by being hanged by the neck until he be dead.

مذکورہ بالا انگریزی جملے کا لفظ بلفظ ترجمہ اس طرح ہے۔

کوئی عہدیدار اس سپاہی پر جنرل کورٹ مارشل کے حضور خون ہتھیار کا گناہ ثابت ہوتو اس پر حکم دیا جاویگا کہ گلے سے لٹکایا جائے جب تک مر جاوے۔

اس کے بعد اس کا درست ترجمہ دیا ہے جو اس طرح ہے۔ ''جب جنرل کورٹ مارشل میں کسی عہدیدار یا سپاہی پر خون ثابت ہوتو وہ پھانسی پاوے۔''

اس نے ایک اور مثال دی ہے کہتے ہیں۔

One o f the most common mistake is attemting to translate one languahe into another kiterally; for example, once I was in Bombay three officers were living togather in a tent studying for the

Hindoostanee examination ,one dayshilst paying them a visit ,a well known Bombay Moonshee entered ,after a short time,one of them asked him to translate the following s4ntence . "What time eclapced between your first and second visit to the guard." which he did thus,

تمہارے پہلے دفعے جانے کے بیچ دوسری دفعہ گارڈ کو دیکھنے میں کتنی دیر تھی۔اس کے فوراً بعد وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ انھین کہیں اور مصروفیت ہے۔یہ ترجمہ لفظی تھا اسے ہندوستانی محاورے کے مطابق نہیں کہا جا سکتا۔اسی وقت ایک اور منشی خیمے مین داخل ہوئے ان سے بھی مذکورہ بالا جملے کا ترجمہ کرنے کے لئے کہا گیا۔انھوں نے اس جملے کا اس طرح ترجمہ کیا۔"تم نے کتنی دیر بعد دوسری دفعہ گارڈ کو دیکھا۔"منشی نظام الدین نے ایک مثال دی ہے وہ کہتے ہیں کہ انگریز لوگ عام طور پر اس طرح سے بولتے ہیں جیسے"میں معلوم نہیں۔۔ہم جائیگا۔۔اسے مجھے بیچو گے۔۔میں ابھی آتی ہوں۔۔"تمام دیسی لوگ ان کی جملوں کا مطلب سمجھتے ہیں مگر اس کی وجہ سے یہ جملے درست نہیں ہو جاتے۔"اس نے ایک اور جملے کی مثال دی ہے۔کہتے ہیں۔ایک ترجمہ تھا"وہ بنا جیکٹ پریڈ پر آیا اس لئے میں نے اسے قید کیا"گرچہ جملہ درست تھا مگر بہتر ہوتا کہ اس طرح سے اس کا ترجمہ کیا جاتا۔"وہ جیکٹ پہن کر پریڈ پر نہین آیا اس لئے میں نے اس کو قید کیا۔"اسی طرح ایک جملہ تھا"تمہارا شریک آیا تھا بولا کہ تم مر گئے"یہ جملہ مندرجہ ذیل انگریزی کا ترجمہ تھا۔

your partner came and sent forth that you were dead.

منشی نظام الدین کہتے ہیں کہ اس جملے کا بہتر ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے تھا۔"تمہارا شریک آیا تھا بولا کہ میرا شریک مر گیا"۔

منشی نظام الدین نے shall,will,may,should,would,let him

وغیرہ کے استعمال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ''وہ مارا جاویگا۔ He will be killed
''وہ آویگا'' He will come ''اگر وہ ہند میں آئے تو البتہ مر جائیگا'' If he should come to India he will not live میں چاہتا ہوں کہ وہ آوے I wish that he would come حکم ہے کہ وہ مارا جاوے۔
It is an order that he will be killed - دروازہ کھولو تا کہ میں اندر آؤں۔ Open the door that I may come ممکن نہیں کہ وہ وہاں جاوے۔ It is not possible for him to go there ارسطو نے ''نقادوں کے اعتراض اور ان کا جواب دینے کے چند اصولوں'' کے عنوان سے شاعروں کے طریقۂ کار، ان کی زبان، ان کی غلطیوں، وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اور اصول مترجم پر بھی نافذ ہوتے ہیں لہذا سرسری طور پر ان کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔۔۱۔ مترجم چیزوں کو اس طرح پیش کر سکتا ہے جیسی وہ تھیں یا ہیں ۔۲۔ یا جیسی کہ وہ سمجھی جاتی ہیں یا بیان کی جاتی ہیں ۳۔ یا جیسی کہ انھیں ہونا چاہئے۔۴۔ غلطی دو طرح کی ہوسکتی ہے اصلی اور اتفاقی۔ اصل غلطی یہ ہے کہ جو ترجمہ کر رہا ہے اس میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو پھر بھی ترجمہ کرے اس صورت میں اس کا ترجمہ اصلی اعتبار سے غلط ہوگا۔ اتفاقی غلطی یہ ہے کہ ایک شخص اچھی طرح ترجمہ کر سکتا ہے مگر انتخاب میں کبھی کبھی غلطی کرتا ہے مثلاً وہ ایک گھوڑے کے متعلق یہ بیان کرتا ہے کہ وہ دونوں سیدھے پاؤں بہ یک وقت اٹھاتا ہے۔۔ یا وہ طب کے متعلق لکھنے میں ناممکن باتیں لکھ جاتا ہے۔ یہ نہ جاننا کہ ہرن کے سینگ ہوتے ہیں اتنی بڑی غلطی نہیں جتنی کہ بھونڈے پن سے اس کی تصویر کھینچنا۔ اگر کوئی بات ایسی کہی گئی ہے جو حقیقت کے مطابق نہیں تو یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ میں نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے جیسا ہونا چاہئے۔ حالی نے جب ایسی سچائی اور حقیقت (شاعرانہ صداقت) کی بات کی جو شاعر کے خیال یا ذہن میں ہے مگر واقعتاً سچ نہیں تو وہ یہی بات کہہ رہے تھے۔

میں نے مضمون کا آغاز آل احمد سرور کے اعتراض سے کیا تھا۔ سرور صاحب کا یہ اعتراض درست نہیں تھا کہ عزیز احمد نے بعض الفاظ اور فقرے چھوڑ دئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ترجمہ ناقص ہوگیا ہے اور یہ کہ ایک جملے کو کئی جملوں میں تقسیم کرنے کی وجہ سے بھی ترجمے میں نقص پیدا ہوا ہے۔ (یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ سرور صاحب نے اس طرح نہیں کہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ سرور ساحب نے ان لفظوں کا اظہار یا استعمال نہیں کیا مگر ان کی منشا یہی تھی۔) سرور صاحب کے اعتراض کے باوجود عزیز احمد کا ترجمہ ٹھیک ہے اور قاری اچھی طرح سمجھ جاتا ہے کہ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے۔ اور ترجمہ ہو یا راست اظہار اصل مقصد یہی ہے کہ مصنف جو کہنا چاہتا ہے قاری اسے سمجھ لے۔ ارسطو نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر شاعر (موجودہ سیاق میں مترجم) کا مقصد حاصل ہوتا ہے تو غلطی قابل التفات نہیں۔ کیونکہ اس غلطی کی وجہ سے بنیان کا کوئی حصہ زیادہ پر اثر ہو جاتا ہے۔ تاہم غلطی سے احتراز کرنا چاہئے۔ مترجم نے کئی بات اس طرح سے کہی جو حقیقت کے مطابق نہیں تو بھی کوئی ہرج نہیں وہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے ایسا لکھا جیسا ہونا چاہئے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس نے اس طرح لکھا جیسا جبہ وہ مشہور ہے۔ مترجم کو بھی اس بات کی اجازت ہے کہ وہ کسی لفظ یا زبان کے نئے معنی میں استعمال کرے۔ کبھی کبھی کسی لفظ کے معنی مبہم ہوتے ہیں۔ اور ضرورت ہوتی ہے کہ مترجم وہاں ضرورت کے مطابق اس مبہم لطف کا استعمال کرے۔

عزیز احمد کے بعد تین جید عالموں کے ترجمے بھی پیش کئے گئے ہیں اور ان میں بھی وہ سب عیوب موجود ہیں جو عزیز احمد کے یہاں ہیں۔ دراصل ترجمے کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہی ہم اچھا ترجمہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہمارے ترجمے کا مقصد کیا ہے۔ ایک مقصد تو ترجمانی یا اظہار خیال ہے دوسرا مقصد اصل (Original) میں جو کیفیت ہے اسے بھی ترجمانی کے ساتھ ساتھ منتقل کرنا ہے۔۔ اصل کیفیت کی بات تخلیقات کے ترجمے سے تعلق رکھتی ہے۔ خبروں کے ترجمے میں یا علمی موضوعات کے ترجمے میں کیفیت کی ترجمانی کی ضرورت نہیں اس لئے کہ وہاں کیفیت کی اہمیت

نہیں اور نہ وہاں عام طور پر کوئی کیفیت ہوتی ہے۔یہیں ترجے کی اقسام کی بات آتی ہے۔مرزا حامد بیگ نے بنیادی اہمیت کی حامل اقسام کی تقسیم اس طرح سے کی ہے۔ا۔علمی ترجمہ۲۔ادبی ترجمہ۔۳صحافتی ترجمہ۔ اس سے انکی مراد ہے علمی موضوعات کا ترجمہ۔۲۔ادبی موضوعات کا ترجمہ اور صحافتی موضوعات کا ترجمہ ہے ۔انھون نے ترجمہ کی تین راہیں بھی بتائین ہین میں اسے ترجمے کے تین طریقے کا نام دیتا ہوں۔ وہ ہین لفظی ترجمہ۔۲ آزاد ترجمہ اور معتدل ترجمہ (تخلیقی ترجمہ)ترجمے کی ان قسموں اور طریقوں پر گزشتہ مضامین میں بات ہوچکی ہے ۔اور ابھی عزیز احمد پر آل احمد سرور کے اعتراض کی بات مکمل نہیں ہوئی۔کیتھارسس کے ترجمے کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔''افلاطون نے ڈرامے پر یہ الزام لگایا تھا کہ جذبات کو برانگیختہ کرتا ہیاور اس طرح انسان کو عقلی بنانے کی بجائے جذباتی بناتا ہے۔ارسطو یہ کہتا ہے کہ ٹریجڈی ترس اور خوف کے جذبات کو ابھار کر اسے ایسے مقام پر لے آتی ہے جہاں وہ تھک کر ختم ہو جاتے ہیں بلکہ امید و ہمت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔اس عمل کے لئے وہ katharsis کا لفظ استعمال کرتا ہے۔عی عمل انسان کے اندر اسی طرح ہوتا ہے جیسے یونانی طریوۂ علاج میں منضج کے ذریعے بیماری کو ابھارا جاتا ہےاور پھر مسہل کے ذریعے اس کو اعتدال و توازن پر لایا جاتا ہے۔اسی لئے ٹریجڈی میں کردار، پلاٹ،طرز،خیال،تماشا، گیت اور بحیثیت مجموعی اس کی لمبان کی موزونیت کو نہایت ضروری قرار دیتا ہے۔وحدت اثر،شاعرانہ صداقت،اور قرین قیاس ہونا۔۔۔وہ عام اصول ہے جن پر ارسطو نے زوع دیا ہے۔ارسطو فارم کو خاص اہمیت دیتا ہے۔وہ کہتا ہے ٹریجڈی ہمارے جذبات کو فارم عطا کرتی ہیاور اس طرح ان پر قابو پالیتی ہے۔اور جذبات ویسے خطرناک نہیں رہتے جیسا افلاطون نے اسے سمجھا اور بتایا ہے۔افلاطون نے کہا تھا شاعر چونکہ الہامی قوتوں کے قبضے میں ہوتا ہیاس لئے اسے تنظیم کے تحت نہیں لایا جا سکتا۔ارسطو نے فارم پر زور دے کر یہ بتایا کہ شاعر بھی ویسا ہی منظم کام کرتا ہے جیسا

کہ فلسفی۔ فارم کی وجہ سے شاعری انسان کے اندر توازن پیدا کرتی ہے۔ تاریخ اس چیز کو بیان کرتی ہے جو ہو چکی ہے۔ شاعری ان چیزوں کو سامنے لاتی ہے جو ہو سکتی ہیں۔ اسی شاعری، تاریخ کے مقابلے میں زیادہ فلسفیانہ، اور زیادہ لائق توجہ ہے۔ آفاقی صداقتوں سے افلاطون کا مطلب اس قسم کی چیزوں سے ہے جنھیں خاص قسم کے اشخاص خاص حالات میں کہیں گے یا کریں گے۔ اور یہی شاعری کا مقصد ہے۔ فارم کا تصور ارسطو کا سب سے اہم اضافہ ہے افلاطون نے شاعری کو مواد کے نقطہ نظر سے دیکھا تھا اور اسی لئے زندگی کے بے معنی نقل سمجھا تھا۔ ارسطو اسے فارم کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ زندگی کا کوئی فارم نہیں ہے جب کہ ٹریجڈی کا مین آغاز ہوتا ہے، وسط ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ ہوتا ہے اور ہر حصہ ایک دوسرے سے پیوست ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک اس فارم کی شکل منطقی ہے اور اس کا اثر اخلاقی ہے ٹریجڈی کا ہیرو نہ کامل انسان ہوتا ہے نہ وہ بدکار ہوتا ہے بلکہ بنیادی طور پر شائستہ اور نیک ہوتا ہے لیکن اس کے اندر ایک عقم، ایک کمزوری (Hamertia) ہوتی ہے جو اس کی بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ یہ کمزوری اخلاقی غلطی ہے اور ممکن ہے کہ اس کی یہ غلطی شعوری نہ ہو بلکہ فیصلے کی غلطی ہو لین اس سے اس وقت بھی ہمارے تصور انصاف کو ٹھیس نہیں پہنچتی جب وہ بہترین حالات سے قعر مذلت میں گر جاتا ہے۔ مصائب و آلام اسے گھیر لیتے ہیں۔ فارم کا وجود اصلاح کا اثر رکھتا ہے۔ شاعر بالکل پاگل انسان نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک گہرا اور منظم شعور ہوتا ہے۔

مذکورہ سطور کو بعض حضرات غیر ضروری سمجھ سکتے ہیں مگر میرے خیال میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اور ضرورت ہے کہ ان پر تفصیلی گفتگو ہو۔ عصر حاضر میں طرز زندگی اور طرز حیات کے ساتھ مقصد حیات کی بات بھی نمایاں ہو رہی ہے۔ سب سے اہم سوال جو کسی باشعور اور حساس آدمی کو بے چین کرتی ہے وہ یہ کہ آخر انسان کا مقصد حیات کیا ہے۔ آخر اس کے ہونے کی یا جو کچھ وہ دیکھ یا محسوس کر رہا ہے یاد یکھ نہیں رہا محسوس بھی نہیں کر رہا مر جو ہیں ان سب کا مقصد کیا ہے۔ غالب عصر حاضر کے شاعر

معلوم ہوتے ہیں جب وہ کہتے ہیں "نہ ہم ہوتے تو کیا ہوتا" یا "سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے۔"

سقراط افلاطون اور ارسطو کی کتابوں پر آج غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے کہ عصر حاضر میں ان کے مطالب کا جائزہ آج کے انسان کی زندگی کو زیادہ بامعنی بنائے گی اور اس کے دکھ اور آشوب آگہی کو کم کرنے کا سبب ہوگی۔ البتہ اب فلسفیوں کی باتوں کو بہتر ڈھنگ سے سمجھنے کے لئے ہمیں قران کریم سے بھی روشنی ملے گی۔ قران کا ایک نام فرقان بھی ہیا س لئے کہ وہ ہمیں مختلف چیزوں میں جو فرق ہے وہ بتاتا ہے اور ساتھ ہی مختلف یکساں یا غیر یکساں چیزوں مین جو مشابہت ہے اس پر روشنی ڈالتا ہے۔ بشرطیکہ اس کتاب کو قابل پرستش سمجھنے کی بجائے اسے رہنا اصولوں اور روشنی کا مینار سمجھا جائے اس لئے کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ مسائل کو سمجھنے کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ شاعری رفنکاری کی ماہیئت اور اس کے اصول بھی اس سے اخذ کئے جائیں تو معاملات اور مسائل کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ اور اس سے افلاطون اور ارسطو کے مذکورہ بالا بحث کو بھی سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ katharsis کے ترجمے کی بحث سے کئی بنیادی سوال پید ہوتے ہیں۔

شاعر کے بارے میں قران کریم نے اپنے مخصوص انداز میں مختصر مگر جامع روشنی ڈالی اور بتایا ہے کہ شاعر کا بنیادی وصف یہ ہے کہ "وہ ہر وادی میں سر گرداں پھرتے ہیں" اور یہ کہ "وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں" (الشعرا آیت ۲۴ سے ۲۶) یعنی ان کے قول و فعل میں ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ جو بات شاعر کے بارے میں کہی گئی ہے وہ ہر اچھے فنکار کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اچھا فنکار عام طور پر سماجی نظم وضبط اور قیود کا پابند نہیں ہوتا۔ اسی سے افلاطوں اسی اپنی خیالی جمہوریت سے عزت کے ساتھ باہر کردینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ کوئی اچھا فن پارہ ۔ شعر، افسانہ، ڈرامہ، تصویر، موسیقی، رقص بیکار کی چیز ہے۔ یہ تخلیقات انسانیت اور سماج کے فروغ کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ جس طرح زندہ رہنے کے لئے سانس

کی اہمیت ہے اسی طرح سماج کی صحت کے لئے تخلیقی فن پاروں کی ضرورت ہے۔ شاعر، موسیقار، مصور، کہانی کار اداکار، ڈرامہ کار سماج کی تطہیر اور صحت مند ارتقا کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اچھا مترجم بھی فنکار ہوتا۔ اور وہ بھی شاعر، مصور اور کہانی کار وغیرہ کی طرح سماج کا ایک بہت ضروری جزو ہے۔ جرورت ہے کہ ہم ترجمہ کرنے والوں خاص طور پر تخلیقات، شاعر، ڈرامہ، کہانہ، ناول اور مختلف علوم کا ترجمہ کرنے والوں کی قدر کریں اور ترجمہ کاری کی اہمیت کو سمجھیں۔

ہندوستان ہو یا پاکستان اردو میں ترجمہ کاروں کی اہمیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ہند و پاک مین اس وقت جو ادیب سب سے زیادہ قابل احترام ہے اور جس نے مولوی عبدالحق کے بعد اردو کو اور اردو سماج کو سب سے زیادہ ثروت مند کیا ہے وہ ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ انھوں نے تنہا کسی بھی ادارے سے زیادہ وقیع کام کیا ہے۔

خیر یہ تو جمہ معترضہ تھا۔ بات ہو رہی تھی ترجمے کے تقابلی مطالعے کی اس سلسلے میں حسن الدین احمد کی کتاب ''ساز مغرب'' کا مطالعہ مفید ہوگا انھوں نے متعدد نظموں کے مختلف اردو ترجموں کو یکجا کر دیا ہے جس سے قاری کو ترجمے کے مختلف نکات سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

ترجمہ کاری مشکل فن ہے مگر مشق اور مطالعہ سے ترجمے کی لیاقت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے اور چاہے ترجمے میں تخلیق کی شان پیدا نہ ہو مگر کرافٹ تو حاصل ہوسکتا ہے۔ فن ترجمہ کے اصول اور مبادیات کی باتوں مین سب سے اہم یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ مشق کی جائے اور ترجمے کا معاوضہ بڑھایا جائے۔ مترجمیں کو بھی انعامات واعزاز دئے جائیں ابھی کچھ ادارے مترجمین کو انعامات دیتے ہیں مگر ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ ادرایسا کیا جائے۔۔ اور مترجمیں کی ایک ڈائرکٹری بنائی جائے۔

ہمارے مترجمیں میں حسن عسکری کا نام اہم ہے انھوں نے میڈم بواری کا اردو ترجمہ کیا ہے جس کی عام طور پر تعریف کی گئی ہے مگر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ حسن

عسکری میڈم بواری کو اچھی طرح سمجھ ہی نہیں سکے لہذا ان کا ترجمہ ناقص ہے۔ کلیم صاحب نے اردو تنقید پر ایک نظر کے تازہ اڈیشن میں میڈم بواری کے اقتباسات دئے ہیں اور کہا ہے کہ حسن عسکری صاحب ''کنجی'' کی مدد سے بھی اس کا ترجمہ نہیں کر سکتے۔ اب کلیم صاحب سے زیادہ تعلیم یافتہ، باشعور، مختلف زبانوں کا عالم اور ادب کی سمجھ بوجھ رکھنے والا ناقد جب یہ کہہ رہا ہے تو عام ناقد کیا کہہ سکتا ہے۔

ظ۔ انصاری نے بہت عمدہ ترجمے کئے ہیں'' وہ کہتے ہیں ممکن ہے عبارت کا مفہوم اس لئے صاف نہ ہو کہ مصنف کی بیانہ کمزوری سے وہ الجھا رہ گیا ہو۔ اگر مصنف کو قدرت ہوتی یا اسے معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ اس کی عبارت گنجلک ہے تو وہ اسے زیادہ وضاحت اور سلاست کے ساتھ بیان کرتا۔ اگر یہ صورت نظر آئے تو ترجمہ کرنے والے کی قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے الفاظ کا ضافہ یا انداز بیاں میں کچھ تبدیل کر کے انھیں ایسے لکھے کہ عبارت سلجھ جائے۔''

لیکن اس مقام پر عبارت گنجلک رکھنے کا کوئی خاص مقصد ہو کہ بعض مواقع کے لئے یہی رویہ درست ہوتا تو (خاص طور پر شاعری میں ایسے کئی مقامات آتے ہیں جہاں نکتے کو سلجھانا ضروری نہیں ہوتا۔ آرٹ میں بعض تاریک گوشے اصل مقصود کو نمایاں کرنے کے لئے رکھے جاتے ہیں یا بعض جگہ کسی مجبوری کی وجہ سے پردہ ڈالنا ضروری ہوتا ہے مثلاً حکومت وقت، یا سماج یا اخلاق اس پر معترض ہو سکتا ہے۔ ایسے مواقع پر حجاب کی ضرورت ہوتی ہے مترجم کو اس کا خیال رکھنا چاہئے۔

اردو میں عام طور پر انگریزی سے ترجمے ہوتے ہیں اور کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ یہ انگریزی ترجمہ اردو سے یا کسی اور زبان سے انگریزی میں کئے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اصل عبارت کے مصنف کے اسلوب کو پیش نظر رکھا جائے۔

ترجمے میں غلطی کے نتیجے میں بعض اوقات زبردست غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں مثلاً ہندوستانی مصوری کے ناقدین میں یہ خیال عام ہے کہ اکبر کے زمانے میں

ماڈل مصور کے سامنے بیٹھ کے تصویر بنواتے تھے۔ یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ H. Blockmann نے آئین اکبری میں درج، ذیل کے جملے کو غلط سمجھا اور اس لئے اس کا غلط ترجمہ کیا۔ ''جائے تصویر راخود نشانند باشارات والا پیکر ہمگی ملازمان دولت جاوید طراز زرا تصویر نمودند''

اس کا ترجمہ Blockmann نے اس طرح کیا ہے۔

(Akbar himse) sat for his likeness and also ordered to have the likeness taken of all the grandness of the realm" مذکورہ فارسی عبارت کا درست ترجمہ اس طرح ہے۔

" He himself marked the places for illustration . By his order , the likeness were taken of all the grandness of the realm"

ماخوذ از آرٹ مصنف سید مجید اللہ۔

لفظ ہندوستان کے متعلق بھی یہ غلط فہمی عام ہے کہ چونکہ عربی یا فارسی میں لفظ سین نہیں ہے اس لئے وہ سین کی جگہ ''ہے'' بولتے ہیں یا یہ کہ ''سین'' کی آواز ''ہے'' سے بدل جاتی ہے اس لئے ایران والوں نے سندھ کو ہند کر دیا۔ یہ غلط فہمی تاریخ کی کتبوں سے نکل کر تما لوگوں میں پھیل رہی ہے جب کہ حقیقت یہ کے کہ فارسی اور عربی دونوں میں سین بھی موجود ہیں اور ہے بھی۔ علاوہ ازیں اہل عرب الہندیہ کے دونوں علاقوں یعنی ہند اور سند سے بخوبی واقف تھے۔ علاوہ ازیں ہند اگر سندھ کا corruption ہوتا تو اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ مگر ہند کے معنی ہیں۔

قران کریم کا پہلا جامع اردو ترجمہ شاہ عبدلقادرؒ نے کیا تھا۔ یہ لفظی ترجمہ تھا مگر اس میں وسعت تھی۔ مثال کے طور پر سورہ قیامہ کی چند آیات کا ترجمہ پیش ہے۔

''قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی (۱) اور قسم کھاتا ہوں جی کی جو الہنا دیتا

ہے (۲)۔ کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ ہم جمع نہ کریں گے اس کی ہڈیاں، (۳) پوچھتا ہے کب ہے قیامت کا دن (۶)۔ پھر جب چندلانے لگے تیور، (۷) اور گہہ جاوے چاند (۸) اور اکٹھے ہوں سورج اور چاند، (۹) کہیگا اس دن آدمی، کہاں جاؤں بھاگ کر (۱۰) کوئی نہیں، کہیں نہیں بچاؤ۔ (۱۱) پھر مقرر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول بتانا (۱۹)۔ کوئی نہیں۔ پر تم چاہتے ہو شتاب ملنے کو (۲۰) اور چھوڑتے ہو دور آنے کو، (۲۱) کتنے منہ اس دن تازے ہیں (۲۲)، اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوئے (۲۳)، اور کتنے منہ اس دن اداس ہیں (۲۴)، اس خیال میں ہیں کہ ان پر ہووے جس سے کمر ٹوٹے، (۲۵) کوئی نہیں۔ خرابی تیری، (۳۴) خرابی پر خرابی تیری۔ (۳۵) کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا بے قید' (۳۶)'۔

اب مذکورہ بالا آیات کا ترجمہ جو فتح محمد جالندھری نے کیا ہے پیش ہے۔

''ہم کو روز قیامت کی قسم۔ (۱) اور نفس لوامہ کی (کہ سب لوگ اٹھا کر کھڑے کئے جائینگے) (۲)۔ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی (بکھری ہوئی) ہڈیاں اکٹھی نہین کریں گے (۳) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا (۶)۔ جب آنکھیں چندھیا جائیں (۷)۔ اور چاند گہنا جائے (۸) اور سورج اور چاند جمع کر دئے جائیں (۹)۔ اس دن انسان کہیگا (اب) کہاں بھاگ جاؤں (۱۰)۔ بیشک کہیں پناہ نہیں (۱۱) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے (۱۹) مگر (لوگو) تم دنیا کو دوست رکھتے ہو (۲۰) اور آخرت کو ترک کئے دیتے ہو (۲۱) اس دن بہت سے منہ رونق دار ہونگے (۲۲) (اور) اپنے پرور دگار کے محو دیدار ہونگے (۲۳) اور بہت سے منہ اس دن اداس ہونگے (۲۴) خیال کریں گے کہ ان پر مصیبت آنے کو ہے (۲۵) افسوس ہے تجھ پر پھر افسوس ہے (۳۴) پھر افسوس ہے تجھ پر پھر افسوس ہے (۳۵) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائیگا۔ (۳۶)

مولانا محمد علی لاہوری نے مذکورہ آیات کا مندرجہ ذیل ترجمہ کیا ہے۔

نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں (۱) اور نہیں میں ملامت کرنے

والے نفس کی قسم کھاتا ہوں (۲) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے (۳) پوچھتا ہے قیامت کا دن کب ہے (۶) سو جب نظر خیرہ ہو جائیگی (۷) اور چاند تاریک ہو جائے گا (۸) اور سورج چاند اکٹھے کر دئے جائیں گے (۹) اس دن انسان کہیگا کہاں بھاگ کے جانا ہے (۱۰) ہر گز جائے نہیں کوئی جائے پناہ (۱۱) پھر ہمارے ذمے اس کا کھول کر بتانا ہے (۱۹) ہر گز نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت کرتے ہو (۲۰) اور آخرت کو چھوڑتے ہو (۲۱) (کچھ) منھ اس دن تر و تازہ ہونگے (۲۲) اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہونگے (۲۳) اور (کچھ) منھ اس دن بڑے بنے ہوئے ہونگے (۲۴) جان لیں گے کہ ان پر پیٹھ توڑنے والی مصیبت آنے والی ہے (۲۵) افسوس ہے تجھ پر اور افسوس! (۳۴) پھر افسوس ہے تجھ پر اور افسوس! (۳۵) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ مہمل ہی چھوڑ دیا جائیگا (۳۶)

مذکوہ آیات کا ترجمہ مولانا محمد حسن نے مندرجہ ذیل طریقے سے کیا ہے۔

قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی (۱) اور قسم کھاتا ہوں جی کی جو ملامت کرے بڑائی پر (۲) کیا خیال رکھتا ہے آدمی کی ہم جمع نہیں کرینگے اس کی ہڈیاں (۳) پوچھتا ہے کہ کب ہوگا دن قیامت کا (۶) پھر جب چندھیانے لگے آنکھ (۷) اور گہ جائے چاند (۸) اور اکٹھے ہوں سورج اور چاند (۹) کہے گا آدمی اس دن کہاں چلا جاؤں بھاگ کر (۱۰)، کوئی نہیں کہیں نہیں۔ (۱۱) پھ مقرر ہمارا ذمہ ہے کھول کر بتلانا (۱۹) کوئی نہیں پر تم چاہتے ہو جلد (۲۰) اور چھوڑتے ہو جو دیر میں آئے (۲۱) کتنے منھ اس دن تازہ ہیں (۲۲) اپنے رب کی طرف دیکھنے والے (۲۳) اقر کتنے منھ اسدن اداس ہیں (۲۴) خیال کرتے ہیں کہ ان پر وہ آئے جس سے کمر ٹوٹے (۲۵) خرابی تیری خرابی پر خرابی (۳۴) پھر خرابی تیری خرابی پر خرابی تیری (۳۵) کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہیگا بے قید (۳۶)

مذکورہ ترجمے چونکہ قران کریم کے ترجمے ہیں ظاہر ہے مترجمین نے بے حد احتیاط سے کام لیا ہے اس کے باوجود مترجمین کے ترجموں میں اختلاف ہیں۔ اب

ان ترجموں کی اصل ملاحظہ کیجئے۔ تب بات سمجھ میں آئے گی کی ان ترجموں میں کتنا اختلاف ہے۔

لا اقسم بیومہ القمۃ(۱) ولا اقسم با لنفس الوامۃ(۲) ایحسب الانسن الن نجمع عضام(۳) یسئل ایان یوم القیامۃ(۶) فا ذا برق البصر (۷) و خسف القمر(۸) و جمع الشمس و القمر(۹) یقول الانسان یومیذ این المفر(۱۰) کلا لا وزر(۱۱) ثمہ ان علینا بیانہ(۱۹) کلا بل تحبون العاجلۃ(۲۰) و تزرون الاخرۃ(۲۱) وجوہ یومیذ ناضرۃ(۲۲) الیٰ ربھا ناظرۃ(۲۳) وجوہ یومیذ نا باسرۃ(۲۴) تظن ان یفعل بھا فاقرۃ(۲۵) اولیٰ لک فا ولیٰ(۳۴) ثم اولیٰ لک فاولیٰ(۳۵) ایحس الانسان ان یترک سدی(۳۶)

ترجموں کی وجہ سے جہاں چراغ سے چراغ جلتے ہین اور ایک تہذیب وتمدن سے دوسری تہذیب وتمدن استفادہ کرتی ہے وہیں کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہین۔ مثلا اردو میں زیادہ تر اصطلاحات عربی کی بجائے فارسی سے آئی ہین اس لئے ہم نے صلات کی جگہ نماز۔ صوم کی جگہ روزہ اختیار کرلیا ہے۔ جبکہ صلات اور نماز میں نمایاں فرق ہے۔ فارسی چونکہ آرین تہذیب کی زبان ہے (بجا طور پر اسے سنسکرت کی بہن کہا جاتا ہے) اس لئے سامی تہذیب وروایت کو اچھی طرح سے واضح نہیں کرتی۔ نماز سنسکرت کا نمو ہے جسکے معنی جھکنا ہے۔ جبکہ صلات عربی ہے اور اس کے لغوی معانی ہیں ''اچھے کام'' نیکی۔ اسی لئے بار بار صلات قائم کرنے کی بات کی جاتی ہے۔ صلات کے اصطلاحی معنی ''ایک خاص طرح کے افعال اور اقوال ہیں، جن سے عام طور پر مسلمان واقف ہیں۔ عورت عربی کا لفظ ہے مگر عربی میں اس کے معنی وہ نہیں جو اردو میں ہیں۔ اردو میں عورت کا مطلب ہے Woman جبکہ عربی میں اس کا مطلب ہے جسم کا وہ حصہ جو چھپا رہتا ہے۔ (ستر)

ظ انصاری نے ایک زبان میں کئی زبانیں کے ذیلی عنوان سے لکھا ہے جب

عام انگریزی میں کسی کردار کی زبان سے ایسا جملہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ جس میں کلام ربانی کیسی شان ہوتو اسے انجیل کے انداز بیان سے ملا دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس طرح حتمی یا حرف آخر کے انداز میں بات کرتا ہے گویا وہ ہر راز سے ہر معالے میں م اتنا واقف ہے کہ اس سے زیادہ باکبر ہونا ممکن نہیں۔ یا کوئی شخص اپنی گفتگو اور اپنے احکامات میں مذہبی تقدس کی چاشنی یا اس کا سارنگ ابھارنا چاہتا ہ تو اس ک زبان سے ایسے جملے لکھے جاتے ہین۔ جو سادہ انگریزی میں ہونے کے باوجود اپنے گرد تقدس کا ہالہ رکھتے ہیں۔ اور انجیل کے جملوں، استعاروں، کہاوتوں، اور ہدایتوں سے مشابہت پیدا کر لیتے ہیں۔ جہاں سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے وہیں سے ترجمے کی عبارت میں تبدیلی کرنی چاہیے۔ اور جس زبان مین ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان میں بھی اسی لب و لہجے کے مقدس، پرشکوہ، پرتکلف الفاظ و محاورات تلاش کرنے ہونگے جن سے کلام ربانی کی جھلک ملے۔ مثلاً ایک شخص مبلغ ہے اور وہ بتا رہا ہے

Have confidence in it Or less ye forever be condemed

اب اگر انگریزی لفظ Confidence کا ترجمہ ایمان کی بجائے یقین، بھروسہ یا اعتماد کر دیا اور اس کے بعد والے جملے کا سیدھا ترجمہ کر دیا گیا کہ "تم ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہو گے" یا ہمیشہ تم دھتکارے جاؤ گے" تو عبارت کی اصل فضا غارت ہو جائے گی کیونکی انگریزی کا جملہ خاص انجیل کی عبارت کا حصہ ہے۔ مذکورہ بالا جملے کا بہتر ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔ "اس پر ایمان لاؤ ورنہ ابد تک معتوب رہو گے" ظ انصاری نے ایک دوسری مثال دی ہے۔ "وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی انگریز کسان کسی مہمان سے کہتا ہے Come in,have dinner تو اس کا ترجمہ اس طرح نہیں ہوگا "تشریف لے چلیے۔ نان شبینہ تناول فرمائیے" ہر چند کہ ترجمہ س صحیح ہوگا تاہم واقعاتی ماحول کے تقاضون کے خلاف ہوگا۔

مولوی نذیر احمد نے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا ہے اور بیحد عمدہ ترجمہ ہے۔ مگر جب انھوں نے قران کریم کا ترجمہ کیا اور اسے با محاورہ بنانے کی کوشش کی تو ان کے

ترجمے پر زبردست ہنگامہ ہوا۔ انھوں نے حضرت محمد ﷺ کے واقعہ ہجرت کے بارے میں لکھا کہ ''وہ راتوں رات سٹک گئے'' اسی طرح فلپ کے حتی کی مشہور کتاب ''عربوں کی تاریخ'' کا جیلانی صاحب نے ترجمہ کیا ہے اور بلاشبہ بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ مگر انھوں نے بھی یہی غلطی کی جو ڈپٹی نذیر احمد نے کی تھی۔ انھوں نے لکھا ''وہ راتوں رات مکے سے مدینے بھاگ گئے'' دونوں ترجمے بالکل درست ہیں مگر ان ترجموں سے قاری کے ذہن پر جو تاثرات مرتسم ہونگے۔ اور اس کا جو در عمل ہوگا اسے دونوں مترجمین نے نظر انداز کر دیا۔

مترجم کا فرض ہے کہ وہ مناسب جملے گڑھے، اگر اسے موزوں جملے دستیاب نہ ہو۔ جیسے کہ ظ انصاری نے War Monger کے لئے جنگ باز کی اصطلاح گڑھی ار وہ چل نکلا میں نے اردو بورڈ میں بے شمار اصطلاحات بنائی تھیں۔ طریقہ یہ تھا کہ موضوع کے ایکسپرٹ اصلاح کی تشریح کرتے تھے۔ اردو کا ماہر اس کا کوئی موزوں لفظ/اصطلاح تجویز کرتا تھا۔ اگر ماہرین اس سے اتفاق نہیں کرتے تو پھر دوسرا لفظ تجویز کیا جاتا تھا۔ میں طبعاً عجلت پسند ہوں اور اس لئے جلد سے جلد اصطلاحیں تجویز کرتا تھا۔ میرے اس عمل سے بعض لوگوں کو حسد ہوتی تھی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب تک میرے ذمے یہ کام رہا، خوب اصطلاحات تیار ہوئین مگر۔

اردو میں ابھی اچھی لغات بھی دستیاب نہیں پرانی لغات سے کام چل رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کی لغت کے لئے کوشش کی جائے۔

☆☆☆

بعض الفاظ قرآنی کے ترجمے اور اس کے اثرات

انَّ ربَّکُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا لاوَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ط اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ سورۃ نمبر سات (الاعراف) آیت نمبر 54 کا ترجمہ فتح محمد جالندھری نے اس طرح کیا ہے:

"کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہے، جس نے آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر جا ٹھہرا، وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے......"

مولانا محمد علی لاہوری نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

"تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ وقتوں میں پیدا کیے۔ پھر وہ عرش پر متمکن ہے رات کو دن کا لباس پہناتا ہے اور وہ اس کے پیچھے لگاتار چلا آتا ہے۔"

مولانا محمد علی کے سوا زیادہ تر مترجمین نے لفظ الیوم کا ترجمہ دن کیا ہے۔ اور اس ترجمے کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہوئے۔ بائبل کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی اصل صورت میں موجود نہیں۔ اور اس کی تفاسیر سے مسلم علما نے استفادہ کرتے ہوئے کئی غلطیاں کیں ہیں۔ ان میں سے ایک غلطی یہ ہے کہ اللہ نے آسمان و زمین کو چھے دن میں بنایا۔ پھر وہ اس مشقت سے تھک گیا تو ساتویں دن آرام کیا۔ یہاں

الیوم کا ترجمہ دن کیا گیا ہے۔ جو مناسب نہیں اس لئے کہ یہاں دن کا مطلب ہے مرحلہ یا وقفہ۔ عربی لغت کے مطابق الیوم کا مطلب دن بھی ہے اور مرحلہ یا وقفہ بھی۔ دن کا مطلب ہے تقریباً ۲۴ گھنٹے کا وہ وقفہ جب سورج طلوع اور غروب کے مرحلے سے گزرتا نظر آتا ہے۔ یعنی زمیں سورج کے چاروں طرف ایک چکر پورا کرتی ہے۔ (قطبین مین دن چھے مہینے کا ہوتا ہے)۔ تخلیق کائنات کے وقت سورج یا نظام شمسی کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب سورج تھا ہی نہیں تو پھر دن کا سوال کیسے پیدا ہوسکتا ہے لہذا یہاں الیوم کا ترجہ دن نہیں بلکہ مرحلہ ہونا چاہئے۔ اگر ہم دن کی بجائے مرحلہ ترجمہ کریں تو ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائیگا۔

خود قرآن کریم نے ''الیوم'' کا مطلب کئی جگہ اس طرح بیان کیا ہے۔

سورہ 32 (السجدہ) آیت 5۔

''وہی آسمان سے زمین تک ہر کام کا انتظام کرتا ہے۔ پھر وہ ایک روز جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ہزار برس ہوگی۔ اس کی طرف صعود (رجوع) کرے گا۔'' (مولانا فتح محمد جالندھری)

''وہ اس امر کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے، پھر وہ اس کی طرف چڑھ جائے گا، ایک دن میں جس کا اندازہ ایک ہزار سال ہے اس سے جو تم گنتے ہو۔'' (مولانا محمد علی لاہوری)

دوسری جگہ سورہ 7 (المعارج) آیت 4 میں الیوم سے مراد ہے پچاس ہزار سال اس آیت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''جس کی طرف روح (الامین) اور فرشتے چڑھتے ہیں (اور) اس روز (نازل ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار برس ہوگا۔'' (مولانا فتح محمد جالندھری)

''فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں ایک دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے۔'' (مولانا محمد علی لاہوری)

حسب بالا سطور سے ظاہر ہے کہ لفظ ''الیوم'' سے مراد ہے ایک ''لمبا عرصہ''

اور اس کا لازمی مطلب 24 گھنٹے والا دن نہیں ہے۔

عیسائی اور یہودی دونوں نے ''دن'' کا مطلب نکالا ہے 24 گھنٹے والا ''دن'' جبکہ قرآن میں چھ دن سے مراد ہے ''چھ وقتوں میں ر چھے مرحلوں میں''۔

یہودی اور عیسائی نے ''دن'' کا مطلب غلط سمجھا (اور بہت سے مسلمان بھی غلط سمجھتے ہیں) اور اسی لیے انہوں نے سمجھا کہ ساتویں دن اللہ نے آرام کیا۔ یہودی اس لیے ساتویں دن کوئی کام نہیں کرتے۔ اس دن کو وہ سبت کا دن کہتے ہیں۔ ہندوستانی عالموں کے یہاں بھی وید میں مذکورہ ''دن'' کے معاملے میں کافی الجھنیں ہیں۔

دراصل دن کا تصور وقت کے تصور سے مربوط ہے۔ اور اس تصور کو سمجھنے کے لیے آئین اسٹائن کا نظریہ اضافت سمجھنا ضروری ہے۔

اگر اس نظریے کو سمجھ لیا جائے تو پھر 24 گھنٹے 10 ہزار سال اور پچاس ہزار سال وغیرہ کی الجھن آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔

ابھی تک بائبل (جس میں تورات شامل ہے) اور قرآن کے تصورات پر گفتگو ہوتی رہی ہے اگر وید کے ''تصور دن'' کو بھی اس گفتگو کا حصہ بنالیا جائے تو بات سمجھنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔

دن کے تعلق سے سورہ 41 (السجدہ) آیت 9 سے 12 میں مزید بیان فرمایا گیا ہے۔

''کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ اور (بتوں کو) اس کا مد مقابل بناتے ہو، وہی تو سارے جہاں کا مالک ہے۔ (۹)

اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا (سب) چار دن میں (اور تمام) طلب گاروں کے لیے یکساں (۱۰) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا، تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ (خواہ) خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے

کہا ہم خوشی سے آتے ہیں (۱۱) پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس (کے کام) کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے مزین کیا اور (شیطانوں) سے محفوظ رکھا۔ یہ زبردست (اور) خبردار (کے مقرر کیے ہوئے) اندازے ہیں۔ (12) (مولانا جالندھری)

کیا تم اس سے انکار کرتے ہو، جس نے زمین کو دو وقتوں میں پیدا کیا اور اس کے لیے ہمسر ٹھہراتے ہو وہ جہانوں کا رب ہے۔ (۹)

اور اس میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکت دی اور اس کی خوراکوں کا اس میں اندازہ کیا (یہ) چار دن میں (کیا) مانگنے والوں کے لیے سب کچھ ٹھیک کر دیا گیا۔ (۱۰)

پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا، سو اسے اور زمین کو کہا، آجاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے، انہوں نے کہا ہم دونوں خوشی سے حاضر ہیں۔ (۱۱)

سو سات آسمان دو دن میں بنایا اور ہر آسمان میں اس امر کا وحی کیا اور ہم نے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور ہر طرح سے اس کی حفاظت کی۔ یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے۔ 12 (مولانا محمد علی لاہوری)

مذکورہ بالا آیات اور گزشتہ آیات کے مطالعے سے ایک غلط فہمی کا امکان ہے۔ وہ یہ کہ ایک جگہ تو زمین آسمان کو آٹھ وقتوں یا آٹھ دنوں میں بنانے کا ذکر ہے اور دوسری جگہ چھ وقتوں یا چھ دنوں میں تو یہ دونوں بیانات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دراصل غور کیجیے تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

آیت ۹ اور آیت ۱۰ (سورہ۔ 41) کو سمجھیے دو دن میں زمین بنی اور دو دن میں اس کی دیگر چیزیں پہاڑ وغیرہ (اس طرح آیت ۹ اور آیت ۱۰ کو ملا کر پڑھیے تو چھ دن نہیں بلکہ 4 دن بنتے ہیں، پھر دو دن میں آسمان بنے اس طرح چھ دن ہوئے۔ تخلیق کائنات کے بارے میں سائنسدانوں کے کئی نظریے ہیں ان میں سے ایک نظریہ قرآنی نظریے کے عین مطابق ہے۔

2۔لفظ ''الیوم'' کے غلط ترجمے اور اس کے اثرات کے بارے میں مختصراً اوپر چند سطور پیش کئے گئے ہیں اب لفظ''فلک'' کے بارے میں ملاحظہ کیجئے۔سورہ 210 آیت 33 میں درج ہے۔

''اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو بنایا (یہ) سب (سورج اور چاند تارے) آسمان سے (اس طرح چلتے ہیں) گویا تیر رہے ہیں۔

(مولانا فتح محمد جالندھری)

اس کا ترجمہ مولانا محمد علی لاہوری نے اس طرح کیا ہے:

''اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب (اپنے اپنے) فلک میں تیزی سے چل رہے ہیں۔''یعنی فلک کا مطلب ہے''محور''یعنی وہ مقررہ راستہ جس پر سیارے یا ستارے متحرک ہیں۔''

3۔الیوم اور''فلک کی طرح لفظ''سبح'' کا مطلب بھی غلط سمجھا گیا ہے۔اس کا مطلب ہے کسی چیز کا بغیر کسی بیرونی دباؤ کے اپنے آپ حرکت کرنا، پانی کے اندر اس طرح کی حرکت کو تیرنا کہتے ہیں اور زمین پہ چلنا۔

4۔اسی طرح لفظ''لموسعون'' کا ترجمہ بالعموم غلط کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ''وسع'' کی جمع ہے۔جس کا مطلب ہے زیادہ کشادہ کرنا، پھیلانا، وغیرہ۔

اس کا ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری نے اس طرح کیا ہے:

''اور آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا اور ہم کو سب مقدور ہے''۔سورہ 51 آیت 47

مولانا محمد علی لاہوری نے اس طرح اس کا ترجمہ کیا:

''اور آسمان کو ہم نے قوت کے ساتھ بنایا اور ہم وسیع قدرت رکھنے والے ہیں''

موجودہ سائنسی نظریے کے مطابق کائنات پھیل رہی ہے اس لیے یہاں اس لفظ کے پھیلنے والے معنی کو ترجیح دینا چاہئے تھا۔''

5۔اسی طرح''علق'' کا ترجمہ بھی بالعموم غلط کیا جاتا ہے۔

مولانا فتح محمد جالندھری نے اس کا مندرجہ ذیل ترجمہ کیا ہے:

"جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا" سورہ (العلق)

مولانا محمد علی لاہوری نے اس کا مندرجہ ذیل ترجمہ کیا ہے:

"انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔"

'علق' دراصل لٹکنے والی چیز ہے۔ لہذا اس کا ترجمہ ہونا چاہئے۔

"انسان کو ایک لٹکنے والی چیز سے پیدا کیا"

6۔ "صلب" اور "ترائب" کے تعلق سے آیت 6 اور 7 سورہ 86 کے ترجمے میں بھی کوتاہی ہے۔ صلب سخت چیز کو کہتے ہیں اور چونکہ پیٹھ سخت ہوتا ہے اس لیے صلب پیٹھ کو بھی کہتے ہیں۔ ترائب عورتوں کے سینے کو کہتے ہیں. لہذا اس کا ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری نے مندرجہ ذیل طریقے سے کیا ہے۔

"سینے کے بیچ سے نکلتا ہے۔" (سورہ 86 الطارق)

اور مولانا محمد علی لاہوری کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"وہ پیٹھ اور پسلیوں کے بیچ سے نکلتا ہے۔"

دراصل اس کا صحیح ترجمہ اس طرح ہوگا۔

'وہ مرد اور عورت کے جنسی اعضا کے ملاپ سے نکلتا ہے۔"

رحمٰن و رحیم اور رب جیسے بنیادی الفاظ کے ترجمے میں بھی لاپرواہی برتی جاتی ہے۔ نتیجتاً کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قران میں ہر جگہ لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے۔ پیار ومحبت کا تو دور دور تک ذکر نہیں۔ حالانکہ قران کا پہلا لفظ ہی اللہ کی صفت رحمانیت سے شروع ہوتا بچہ میں کے رحم مین پرورش پاتا اور وہ ابتدا میں اس قابل بھی نہیں ہوتا کہ ماں سے اپنی خوراک یا ضرورت کی چیزیں مانگ سکے)۔ رحمانیت مکمل محبت ہے۔ یہ وہ صفت ہے جس کے تحت کسی شئے کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس شئے کے کمال تک پہنچنے کے لئے ضروری اسباب فراہم کئے جاتے ہیں۔ اور قران کریم کا دوسرا لفظ رحیم، اللہ کی اس صفت کو بیان کرتا ہے جس کے تحت مذکورہ اسباب

سے فائدہ اٹھانے پر اعلیٰ درجہ کے ثمرات عطا کئے جاتے ہیں۔ ربوبیت وہ صفت ہے جس کے تحت ہر ایک مخلوق کو اس کے دائرے کے اندر درجہ کمال تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد نمبر آتا ہے مالکیت کا یہ وہ صفت ہے جس کے تحت اللہ کی بخشی ہوئی اشیا اور صفات سے فائدہ نہ اٹھانے پر یا ان کا بیجا استعمال کرنے پر سزا ملتی ہے۔

ابھی حال میں ایک فتویٰ جاری ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ باپ نے بیٹے کی بیوی سے مباشرت کر لی اس لئے وہ عورت اب بیٹے پر حرام ہو گئی اور اب وہ دونوں میاں بیوی کی طرح ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یہاں بھی خرابی ترجمے کی وجہ سے ہے۔ زنا ،نکاح اور مباشرت کے فرق کو دھیان میں نہ رکھنے کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی۔

قران کریم کا پہلا جامع اردو ترجمہ شاہ عبدلقادرؒ نے کیا تھا۔ یہ لفظی ترجمہ تھا مگر اس میں وسعت تھی۔ مثال کے طور پر سورہ قیامہ کی چند آیات کا ترجمہ پیش ہے۔

"قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی (۱) اور قسم کھاتا ہوں جی کی جو الہنا دیتا ہے (۲)۔ کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ ہم جمع نہ کریں گے اس کی ہڈیاں، (۳) کیوں نہیں ٹھیک کر سکتے ہیں ہم اس کی پوریاں، (۴) پوچھتا ہے کب ہے قیامت کا دن (۶)۔ پھر جب چندلانے لگے تیور، (۷) اور گہہ جاوے چاند (۸) اور اکٹھے ہوں سورج اور چاند، (۹) کہیگا اس دن آدمی، کہاں جاؤں بھاگ کر (۱۰) کوئی نہیں، کہیں نہیں بچاؤ۔ (۱۱) پھر مقرر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول بتانا (۱۹)۔ کوئی نہیں۔ پر تم چاہتے ہو شتاب ملنے کو (۲۰) اور چھوڑتے ہو دور آنے کو، (۲۱) کتنے منہ اس دن تازے ہیں (۲۲)، اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوئے (۲۳)، اور کتنے منہ اس دن اداس ہیں (۲۴)، اس خیال میں ہیں کہ ان پر ہووے جس سے کمر ٹوٹے، (۲۵) کوئی نہیں۔ خرابی تیری، (۳۴) خرابی پر خرابی تیری۔ (۳۵) کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا بے قید' (۳۶)"۔

اب مذکورہ بالا آیات کا ترجمہ جو فتح محمد جالندھری نے کیا ہے پیش ہے۔

"ہم کو روز قیامت کی قسم۔ (۱) اور نفس لوامہ کی (کہ سب لوگ اٹھا کر کھڑے

کئے جائینگے)(۲)۔ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی (بکھری ہوئی) ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے (۳)۔ ضرور کرینگے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا (۶)۔ جب آنکھیں چندھیا جائیں (۷)۔ اور چاند گہنا جائے (۸) اور سورج اور چاند جمع کر دئے جائیں (۹)۔ اس دن انسان کہیگا (اب) کہاں بھاگ جاؤں (۱۰)۔ بیشک کہیں پناہ نہیں (۱۱) اس روز پروردگار کے پاس ہی ٹھکانا ہے ۔۔ (۱۱) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے (۱۹) مگر (لوگو) تم دنیا کو دوست رکھتے گو (۲۰) اور آخرت کو ترک کئے دیتے ہو (۲۱) اس دن بہت سے منہ رونق دار ہونگے (۲۲) (اور) اپنے پروردگار کے محو دیدار ہونگے (۲۳) اور بہت سے منہ اس دن اداس ہونگے (۲۴) خیال کریں گے کہ ان پر مصیبت آنے کو ہے (۲۵) افسوس ہے تجھ پر پھر افسوس ہے (۳۴) پھر افسوس ہے تجھ پر پھر افسوس ہے (۳۵) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائیگا۔ (۳۶)

مولانا محمد علی لاہوری نے مذکورہ آیات کا مندرجہ ذیل ترجمہ کیا ہے۔

نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں (۱) اور نہیں میں ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں (۲) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے (۳) ہاں ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کے (سارے) اعضا ٹھیک کرین (۴) پوچھتا ہے قیامت کا دن کب ہے (۶) سو جب نظر خیرہ ہو جائیگی (۷) اور چاند تاریک ہو جائے گا (۸) اور سورج چاندا کٹھے کر دئے جائیں گے (۹) (۱۰)۔ بیشک کہیں پناہ نہیں (۱۱) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے (۱۹) مگر ۱۹) مگر (لوگو) تم دنیا کو دوست رکھتے گو (۲۰) اور آخرت کو ترک کئے دیتے ہو (۲۱) اس دن بہت سے منہ رونق دار ہونگے (۲۲) (اور) اپنے پروردگار کے محو دیدار ہونگے (۲۳) اور بہت سے منہ اس دن اداس ہونگے (۲۴) خیال کریں گے کہ ان پر مصیبت آنے کو ہے (۲۵) افسوس ہے تجھ پر پھر افسوس ہے (۳۴) پھر افسوس ہے تجھ پر پھر افسوس ہے (۳۵) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائیگا۔ (۳۶)

☆☆☆☆